بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَ نَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ؕ وَ كَذٰلِكَ نُنْجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

(ترجمہ از بیان القران) سو ہم نے ان کی دعا قبول کی اور ان کو اس گھٹن سے نجات دی اور ہم اسی طرح (اور) ایمان والوں کو (بھی کرب و بلا سے) نجات دیا کرتے ہیں (الانبیاء آیت نمبر ۸۸)

ماہنامہ

راہِ نجات

بارہمولہ کشمیر

جلد نمبر ۱ شمارہ نمبر ۷ بابت ماہِ جولائی ۲۰۱۲ء

سرپرست

عاصیؔ غلام نبی وانی

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر، اونر

منیر احمد وانی

علامہ اقبالؒ
اجتہاد اور تقلید

اِس شمارے میں

نمبر شمار	مضامین	مضامین نگار	صفحہ نمبر
۱	اداریہ	مدیر	۳
۲	اقبال اور اجتہاد.....حقیقت اور پس منظر	ڈاکٹر نذیر احمد زرگر صاحب	۵
۳	اقبال اور تقلید.....ایک تحقیقی جائزہ	سالکؔ بلال احمد وانی	۲۹
۴	تقلید و اجتہاد	عاصیؔ غلام نبی وانی فتح گڈھی	۴۹
۵	پیر رومیؒ کے تین کشمیری مرید	پروفیسر مرغوبؔ بانہالی	۵۴
۶	شرعی اور فقہی اصطلاحات کی وضاحت سوال و جواب کی روشنی میں	عاصیؔ غلام نبی وانی فتح گڈھی	۵۶
۷	درس مثنوی	عاصیؔ غلام نبی وانی فتح گڈھی	۵۹
۸	آپ کے مکتوبات بنام راہ نجات	ڈاکٹر نذیر احمد و مفتی محمد اسحاق نازکی	۶۲

نوٹ

مدیر کا مقالہ نگار کی ہر بات سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے -

Editor ,Printer ,Publisher & Owner =Muneer Ahmad Wani

Printed at :Universal Press Baramulla Near Cement Bridge Baramulla

Published from:Baramulla

Pages 64 excluding Title Cover

ابتدائیہ

حضرت تھانویؒ نے ایک رسالہ تقلید اور اجتہاد کے سلسے میں تصنیف فرمایا ہے۔اور اپنے مخصوص انداز میں اس رسالے کے دیباچہ میں جو چند سطور لکھی ہیں ان کا خلاصہ آسان اردو میں احقر پیش کرنے کی جسارت کررہا ہے۔اور وہی اس رسالے کا بھی دیباچہ تصور کیا جائے۔کیونکہ جس طرح ایک بزرگ عوام میں اپنی خداداد قابلیت کے سبب بزرگ تسلیم کیا جاتا ہے اسی طرح اس کا کلام بھی عام لوگوں کے کلام کے مقابلہ میں اپنی امتیازی شان رکھتا ہے۔

حضرت تھانویؒ نے لکھا کہ موجودہ دور کے بڑے فتنوں میں سے ایک فتنہ تقلید اور اجتہاد کے معاملہ میں باہمی اختلاف نے اختیار کیا ہے۔ایک طبقہ ایسا ہے جو ان بزرگ ہستیوں کے قیاس **(opinion)** کو حرام بلکہ شرک قرار دیتا ہے جنہیں اللہ نے اس نعمت سے نوازا ہے کہ وہ اپنی فراست اور تدبر سے وقتی ضرورتوں اور حالات کے پیش نظر قران وحدیث میں خوب غور وفکر کرکے عوام کے لئے ایک ٹھیک اور عمدہ راستہ نکال سکیں اور لوگ ان کی اس خداداد فہم وفراست سے مستفید ہوسکیں دوسرا طبقہ ایسا ہے جو تقلید (باصلاحیت لوگوں کی پیروی کو) حرام قرار دیتے ہیں اور اجتہاد کو سب کے لئے جائز بتارہے ہیں۔ایک طبقہ امام ابوحنیفہؒ کی تقلید (پیروی) کو حدیث کے مخالف بتاکر نفرت پیدا کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے اور ایک طبقہ تقلید (باصلاحیت علماء کی پیروی کو) واجب بتارہا ہے۔۔ہر شخص اپنا الگ فلسفہ پیش کررہا ہے۔حق پسند علماء لوگوں کو سیدھے راستے پر قائم رہنے کے لئے اور خلاف انصاف باتوں سے بچنے کے لئے کتابیں اور رسالے لکھتے رہے انکی قابل قدر خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے مزید لکھنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر زبان اور ہر جگہ کے لوگوں کا ایک خاص مذاق اور مزاج ہوتا ہے اور اسی مذاق کی روشنی میں بات کو سمجھانا ان لوگوں کے لئے مفید رہتا ہے۔چونکہ آج کل اردو زبان سے لاپرواہی کی وجہ سے اور انگریزی زبان کے ساتھ حد سے زیادہ مشغول رہنے کی وجہ سے ہم ایک ایسے دوراہے پر کھڑے ہوگئے ہیں جس کے متعلق اکبرالہ آبادی نے اپنے ایک شعر میں یوں افسوس کیا ہے ؎

نہ تو ہم انگریز بنے نہ مسلمان رہے☆عمر سب مفت میں کھویا کئے ناداں رہے

نہ ہی انگریزی زبان میں اس قدر سمجھ بوجھ ہے کہ بات کو صحیح ڈھنگ سے سمجھا جائے اور نہ ہی اردو میں اس قدر دسترس (پہنچ) ہے کہ علماء کی ہر بات کو سمجھ سکیں۔چونکہ علامہ اقبالؒ کشمیری ہیں اور ان کے فہم وفراست کو مولانا انور شاہؒ صاحب کشمیری اور مولانا علی میاں ندویؒ جیسے بزرگاں دین نے سراہا ہے۔ان کا اخلاص غیر متنازعہ ہے۔اور انہوں نے اس موضوع پر اپنے معرفت بھرے کلام میں اور کچھ اپنی نثری زبان میں دلنشین تشریح کی ہے۔لہٰذا اپنے بزرگوں سے گذارش کی کہ وہ اس بے لوث دین کے خادم کے خیالات کو آسان اردو میں اپنے دینی بھائیوں کے سامنے پیش کرنے کے لئے اپنا اپنا مقالہ ضبط تحریر میں لائیں جو ہم سب کے لئے کچھ اطمینان سامان فراہم کرسکے۔اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہماری اس کوشش کو بارآور ثابت فرمائے ورنہ بات کو طول دینے کے لئے یا کسی کو نیچا دکھانے کے لئے ہرگز ہرگز یہ خصوصی شمارہ شائع نہیں کیا جارہا ہے۔

——— **مدیر**

اگلا شمارہ کیا ہوگا

اگلا شمارہ بھی گذشتہ شماروں کی طرح ایک خصوصی شمارہ ہوگا۔جس کا نام ’’تاریخ مذاہب اور عصری تحریکات‘‘ ہوگا۔انشاءاللہ

اقبال اور اجتہاد.....حقیقت اور پس منظر

ڈاکٹر نذیر احمد ڈگر صاحب ایم۔اے ایم فل۔پی ایچ۔ڈی اسلامیات کشمیر یونیورسٹی)

اصولی اور بنیادی حیثیت سے دین اسلام کی تکمیل ہو چکی ہے۔کلّیات ہمیشہ کے لئے بیان کر دی گئی ہیں اور بہت سی جزئیات کی تشریح کی گئی ہے۔لیکن اس کے باوجود یہ بھی ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ نئے پیش آمدہ مسائل کی تحقیق کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے تا کہ ہر دور میں مصالح بشریہ کی تنظیم ہوتی رہے اور دین حق کی زندہ وجاوید ہونے کی صفت قائم ودائم رہے۔

دور جدید میں صدائے اجتہاد شدومد کے ساتھ بلند کی جارہی ہے۔اس دلیل کے ساتھ کہ دور جدید میں مسلمانوں کے تنزل وتشتت کے اہم محرکات میں سے ایک بات اجتہاد کا مقفل ہونا بھی ہے یہ مطالبہ کیا جارہا ہے کہ اب اسلام ایک وسیع تر اور ہمہ جہتی اجتہاد کا محتاج ہے۔بلکہ کئی حلقوں کی طرف سے تعلیمات اسلامیہ کی تعبیر نو **(re-interpretation)** کی باتیں بھی ہورہی ہیں۔غور وفکر اور تجسس وتفقد کے بعد ان آوازوں اور مطالبات کے پیچھے اہم اور بنیادی محرکات صرف دو ہی طرح کے معلوم ہوتے ہیں:

(۱) اصلاً دین اسلام بنی آدم کی سرشت میں موجود حیوانی وسفلی جذبات وخواہشات کو ممکنہ حد تک مغلوب کرنا چاہتا ہے تا کہ رذائل کا استیصال ہو اور انسانی طبیعت میں فطری طور پر پائی جانے والی علوی (روحانی وملکوتی) خصائل کو نمو اور پنپنے کا موقعہ مل سکے اور انسان اسفل السافلین کی پست تاریکیوں سے بچ کر احسن تقویم کی اعلیٰ معراج سے ہمکنار ہو جائے۔اس کے برعکس علم وتجربہ کی گہرائی، عقل وشعور کے وسیع تجربات اور تہذیبوں، تمدنوں اور متنوع انسانی معاشروں کے نفسیاتی مطالعہ سے یہ حقیقت اظہر من الشّمس ہو چکی ہے کہ مغربی تصور حیات، اس تصور کی روشنی میں پنپنے والے خاص طرز تعلیم کی بنیاد پر وجود میں آنے والی مغربی معاشرت اور مغربی تہذیب وتمدن اسلام کے مذکورہ بالا بنیادی اوصاف وخصائل کا عین ضد ہے۔نفسیات اور خواہشات نفس کے بے لگام سرمست گھوڑے پر سوار یورپ کا معاشرہ روحانیت کیا اعلیٰ انسانی اقدار تک کے دیوالئے کا شکار ہو چکا ہے۔فرائڈ، مارکس، ڈارون اور رسل جیسے اساطین مغرب کے افکار ونظریات نے وحی الٰہی اور اس کی ناقابل تنسیخ وترمیم ہونے کی صفت کو یکسر خارج از امکان ٹھہرایا۔اسی خدا بیزار روح کے ساتھ اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم کے زیور سے آراستہ ہونے والے ہمارے نوجوان اور جدید تعلیم یافتہ دانشور طبقہ قرآن اور اسلام کے روحانی و

اخلاقی ضوابط کو ہماری مادی ترقی کی راہ میں حائل پاؤں کی زنجیر تصور کر رہے ہیں۔ان حضرات کا کہنا ہے کہ چونکہ دین اسلام آسان ہے اس لئے اس کے اندر سختی صرف ملّا لوگوں کی خود کی پیدا کی ہوئی ہے۔خیال یہ ظاہر کیا جارہا ہے کہ اجتہاد کے ذریعے اسلام میں خارج سے پیدا کی ہوئی سختیوں کو کسی حد تک ختم کیا جاسکے اور دین کو اس حد تک لچکدار بنایا جائے کہ اکیسویں صدی کے جدید تعلیم یافتہ نوجوان کو ''اسلامی زندگی'' گذارنے میں کوئی عذر نہ رہے۔گویا ایسے بے لچک لوگوں کی خاطر اسلام میں اتنی لچک پیدا کی جائے کہ ان حضرات کے کارگاہ ہستی میں شانہ بہ شانہ چلنے کے قابل ہو سکے ورنہ پھر آرتھو ڈاکس ملاؤں کے علی الرغم یہ حضرات ترقی کی دوڑ میں بہت آگے نکل جائیں گے اور اس صورت حال میں اگر اسلام ان حضرات پر اپنی گرفت قائم رکھنے میں ڈھیلا پڑ جاتا ہے تو وہ خود اسلام اور وقت کے تقاضوں سے ناواقف مولویوں کی بدقسمتی ہوگی کہ زمانے کی نبض کا صحیح اندازہ نہ کر سکنے کی وجہ سے امت مسلمہ کو ایک بہت ہی قابل اور ذہین طبقے کی خدمات سے محروم کر دیا۔ان حضرات کا اصل مسئلہ مرغوبات ومأ لوفات نفس کا ہے۔غرض کہ یہ حضرات رند کے رند بھی رہیں اور جنت بھی ان کے ہاتھ سے نہ جائے۔ان لوگوں پر ''آدھا تیتر آدھا بٹیر'' کا محاورہ پوری طرح صادق آتا ہے۔یہی طبقہ ہے جنہیں جدید عالمی نظام کی وضع کردہ اصطلاح میں اعتدال پسند **(moderate)** روشن خیال **(enlightened)** اور آزاد خیال **(liberal)** مسلمان کہا جاتا ہے۔ان کا جتھا دایسی تشریح جدید اور تعبیر نو کا خواہاں ہے کہ جس کے نتیجے میں اعیان مغرب بھی خوش ہوں اور نفس امارہ بھی راضی اور اس سب کے باوجود یہ بھی خواہان دین وملّت ترقی پسند **(Progressive Muslims)** بھی رہیں۔ظاہر ہے کہ اس اجتہاد میں قدامت پسند مولوی اور راسخ العقیدہ جدید تعلیم یافتہ مسلمان جسے طوفانِ مغرب نے ہی مسلمان کر دیا ہو چونکہ کوئی قابل قدر رول نہیں نبھا سکتے اس لئے سرے سے ہی راسخ عقیدہ، صالح عمل اور عمیق علمی بصیرت کی ضرورت ان حضرات کے مجتہد جدید کو ہے ہی نہیں۔

فی الحقیقت اس طبقے کے نزدیک باب اجتہاد کھلا ہے اور بہت ہی وسیع حد تک کھلا ہے۔کہا یہ جاتا ہے کہ یورپ کی ترقی کا راز اس کے مذہب وسیاست کی تفریق میں چھپا ہے۔اس لئے عقل اور منفعت کی رعایت کو نظر میں رکھتے ہوئے ہمیں بھی سیاست کو مذہب کی بالادستی سے آزاد کر دینا چاہیے مذہب کو چند رسومات وعبادات تک محدود رکھتے ہوئے اجتہاد کا حق ان جدید تعلیم یافتہ افراد کو سونپا جانا

چاہیے جو اپنے فیصلہ جات کو ہر حال میں عقل کی رہنمائی میں طے کرنے کی اہلیت وصلاحیت رکھتے ہیں ۔ان حضرات کا یہ بھی فرمانا ہے کہ اس طرح کے اجتہاد مطلق میں مجتہد کو چاہیے کہ مصلحت عامہ اور مقاصد شریعت کے بجائے مغربی تہذیب وتمدن کے اہداف کو نظر میں رکھے۔اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ آج ہم ایسی تہذیب کے آمنے سامنے کھڑے ہیں جس طرح کی تہذیب کا سامنا عربوں کو حضرت عمرؓ کے دور میں تھا بلکہ آج کی غالب تہذیب وتمدن اس جاہل تہذیب وتمدن سے اپنی گونا گوں ایجادات ودریافت اور نئے نئے نظامہائے سیاست اور نئی ہر چیز کی بدولت زیادہ پُر پیچ ہے۔بریں بنا یہ بہت ضروری ہے کہ ایسی تہذیب وتمدن کا مقابلہ ایسے اجتہاد مطلق سے کیا جائے جس میں ہر چیز اور ہر گوشہ حیات پر نظر رکھی جائے۔ورنہ ہم اپاہج ومعذور ہو کر رہ جائیں گے۔

ان حضرات کی مزید یہ رائے ہے کہ چنانچہ ہمیں آج اُس طرح کی لچک کی کوئی امید دکھائی نہیں دیتی جس طرح کی لچک حضرت عمرؓ کے زمانے میں میسر تھی۔اس لئے آج ہمارے اجتہاد کی نوعیت قدرے مختلف ہونی چاہیے۔اس کی بنیاد مکمل طور پر عقل اور نفع ونقصان کی رعایت پر ہونی چاہیے۔اس کے بغیر اور کسی چیز کی بندش نہیں ہونی چاہیے۔ہمیں بھی قوم پرستی اور قومی مفادات کو عمل اجتہاد میں وہی درجہ دینا چاہیے جو یورپ نے دیا اور ہمیں بھی اپنے جدید مجتہدین کے پیچھے اُسی راہ پر گامزن ہونا چاہیے جس راہ پر کہ وہ ہمیں ساتھ لے کر چلنا چاہیں (فیض الخاطر، قاہرہ، مکتب نهض المصریہ اللجنة التالیف ،۱۹۶۵ء شمارہ ۲ صفحہ ۱۷۱ بحوالہ (The Faith of Modern Intelectula-the Religious Aspects and Implications of the Writings of Ahmad Amin William Shepard Vikas House,India 1982,p163-4) یہ ہیں وہ حضرات جو یورپ کی کورانہ تقلید میں تقلیدی اجتہاد کا مشورہ دیتے ہیں وہاں کی ہر چیز کو، ہر رائے کو، ہر ضابطے کو اور ان کے معتقدات اور خیالات کو میعار حق اور ناقابل تردید وتنسیخ گردانتے ہیں اور قران وحدیث زبردستی کھینچ تان کر وہی معانی پہنانے کی وکالت کرتے ہیں جو اُنکے (ideal) معیار پر اتر سکے۔اس طبقے کی منہاج عقل متعین کرتی ہے اسی طرح جس طرح بے مہار عقل مغرب کی امامت کے فرائض انجام دے رہی ہے۔ان دوستوں کے لئے ہم علامہ سے یہ اشعار مستعار لے کر انکی نذر کرتے ہیں ۔

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے ☆ جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

(ب) دوسرا طبقہ ان مخلص لوگوں کا ہے جس میں علماء، صلحاء اور دین وملت اور امت مرحومہ کا درد رکھنے والے ذکی وذہین مسلمان اور بالخصوص جدید تعلیم یافتہ افراد کی متعدبہ تعداد شامل ہے جو عمل کے لحاظ سے اگر چہ کچھ کمزوریوں میں مبتلا ہو سکتے ہیں لیکن عقیدے کے لحاظ سے راسخ اور محبت اسلام ومسلمین میں والہانہ۔یہ تمام حضرات اسلام اور مسلمانوں کے حال ومستقبل کے بارے میں بہت متفکر ہیں۔ان حضرات کا متفکر ہونا بجا ہے۔چنانچہ ان تمام حضرات کا نقطہ نظر خلوص دل کے ساتھ یہی ہے کہ چونکہ اسلام عالمگیر دین ہے اور فطرت کے عین مطابق بھی اس لئے اس میں ہر دور کے مسائل کا حل لازمی طور پر موجود ہونا چاہیے۔یہی وجہ ہے کہ دور جدید کے مسلمانوں کو درپیش مسائل کا حل اجتہاد کے ذریعے تلاش کرنے کی ضرورت ہے تا کہ اس نازک مرحلے پر امت مسلمہ غیر اقوام کی نقالی سے بچ سکے ،اور ساتھ ہی دین کی صداقت وعالمگیریت منقح ہو کر اقوام عالم کے سامنے آجائے جس کے نتیجے میں دعوت دین کے میدان میں مسلمانوں کو خفت اُٹھانے سے نجات مل جائے۔

اس طبقہ ثانیہ کے نزدیک اسلام میں یقیناً لچک اور زمانے کا ساتھ دینے کی پوری صلاحیت موجود ہونے کا مطلب ہر گز یہ نہیں کہ مغربی تہذیب کی طرح یہاں بھی کوئی دینی اور دنیاوی دوئی کا تصور موجود ہو۔یہاں جو دنیا ہے اسی میں دین ہے اور جو امور دین کے ہیں ان ہی میں دنیا کی فلاح مضمر ہے۔ان کا معقول استدلال یہ ہے کہ دین ودنیا کی تفریق نے اگر مغربی تہذیب وتمدن کو کہیں کا رکھا ہوتا تو بات تھی ورنہ حقیقت یہی ہے کہ آئے دن مغربی تصور وطرز حیات کا کارگاہِ ہستی میں ناقابل انطباق ہونا واضح ہوتا جارہا ہے۔مثلاً حب الوطنی اور قوم پرستی کے محض مادی تصورات اور قومی مفادات کی ہر حالت میں اور ہر سطح پر رعایت نے مغرب کو بھیانک اور ہولناک جنگوں پر اکسایا ہے۔اس کے برعکس ہم انہی بنیادوں پر مسلم ممالک میں مسلمانوں کو مغرب کی مخصوص ترقی کی طرف دعوت نہیں دے سکتے۔ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ مسلمانوں کو اسلام کے ابدی صالح اصولوں کی طرف دعوت دیں۔عام مسلمان ملک ووطن کے بجائے دین وملت سے زیادہ قریب ہیں۔نیشنلزم کسی بھی صورت میں ہمارے سیاسی مسائل کا حل نہیں۔ہم صرف اور صرف اسلام کو محور بنا کر مسلمانوں کو اپنی بات منوانے کے لئے تیار کر سکتے ہیں۔یقیناً اس کے لئے حقیقی اسلام کے چہرے سے بدعات و رسومات اور غیر اسلامی نظریات کے غبار کو جھاڑنے کی اشد ضرورت ہے۔یہ کام واقعی مشکل ہے مگر

ناممکن نہیں اور ناگزیر تو ہے ہی۔اس کے لئے ایک وسیع اجتہاد کی ضرورت ہے۔

اجتہاد کی حقیقت اور اس کا پس منظر: اسلام دینِ فطرت ہے۔اس لئے فطرت اور اس کے مطالبات وتقاضاجات سے اس کا ہم آہنگ ہونا اس کی بنیادی صفت ہے۔یہ دین انسان کو جس خدائے ذوالجلال کی طرف بلاتا ہے اس خدا کے بارے میں اس دین کا سرچشمہ یوں اعلان کرتا ہے: كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (قرآن مجید سورۂ الرحمان) یعنی وہ خدائے لم یزل مالک کن فیکون ہر آن نئی شان کے ساتھ تدبیر وتنظیم امور کرتا رہتا ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ

کائنات ابھی ناتمام ہے شاید ☆ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

یہ دین جس امت کی تشکیل کرتا ہے اس امت کے ہر فرد کی شان اس امت کے قائد ورہبر ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے ''**الکلمة الحکمة ضالة المومن حیثما و جد ها فهو احق بها**'' یعنی حکمت ودانائی مومن کا گمشدہ سرمایہ ہے وہ جہاں کہیں بھی اسے پالیتا ہے تو اسے حاصل کرنے کا سب سے زیادہ حق رکھتا ہے (کیوں کہ وہ دین حق پر ایمان رکھنے کی وجہ سے حق شناسی کی صفت سے متصف ہے) مرد مومن کی یہی صفت حق پسندی وحق شناسی اسلام کے حق ہونے اور اللہ تعالیٰ کے واجب الوجود ہونے کی بہت بڑی دلیل ہے۔یہ حقیقت علامہؒ کے ذیل کے شعر میں یوں بیان ہوئی ہے ؎

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان ☆ گفتار میں کردار میں اللہ کی بُرہان

حق تو یہ ہے کہ اسلام دین فطرت ہونے کی بنیاد پر زندگی کے گوناگوں تقاضوں سے گریز وفرار نہیں سکھاتا۔اور ایسا ہرگز ہو بھی نہیں سکتا کہ گریز وفرار اور تقاضاہائے حیات سے لاتعلقی جامد وبے جان نظریات ونظامہائے حیات کی روش ہوتی ہے اس کے برعکس امت مسلمہ کو قرآن مجید میں خیر امت کا خطاب دیا گیا ہے۔گویا یہ امت انسانی برادری کے ہر فرد کی بھلائی وخیر خواہی کے واسطے پیدا کی گئی ہے۔اس لئے ایسی صورت میں یہ خیال بعید از قیاس ہے کہ یہ امت من حیث الجماعت زمانے کے مسائل سے بے بہرہ ہو اور لاتعلق بھی۔یہ بات برملا کہنے کی ہے کہ اسلام وہ دین ہے جو رجعت پسندی کو ہرگز برداشت نہیں کرتا۔آزادی وحریت اور حقوق البشر کا جتنا احترام اسلام کرتا ہے اس سے زیادہ دنیا کے کسی بھی مذہب وفلسفہ زندگی میں ممکن نہیں اور نہ ہی معلوم تاریخ انسان میں اتنا ممکن ہو سکا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔جن انسانی حقوق کی اسلام علمبرداری کرتا ہے ان میں سرفہرست فکر ورائے کی آزادی ہے۔

اجتہاد اور مقاصد شریعت

شریعت اسلام کا مقصد احکام الٰہی کی روشنی میں مقاصد حیات انسانی کو پیش نظر رکھتے ہوئے مسائل کا حل پیش کرنا ہے۔اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ زندگی برابر نت نئے مسائل سے دوچار رہتی ہے۔ان مسائل کا حل اگر شریعت سے مستنبط نہ کیا جائے تو شریعت اور زندگی کا رابطہ ٹوٹ جائے گا۔گویا اس صورت میں ہماری زندگی شریعت سے کنارہ کش ہو کر غیر اسلامی ہو جائے گی مسلمان وحیٔ الٰہی کی برکات سے محروم ہوتے رہیں گے اور نام کے ہی مسلمان دیکھنے کو ملیں گے۔صورت ہی صورت۔نہ سیرت، نہ روح، نہ حقیقت۔اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اجتہاد اور مقاصد شریعت کا آپس میں گہرا ربط وتعلق ہے۔جو شریعت کے مقاصد ہیں انہیں کا حصول اجتہاد کی غایت اور اس کا مدعا ہے۔مثلاً مقاصد شریعت کے تحت فرد کے دین اور اسکی حیات، نسل، مال اور عقل کا تحفظ اولین حیثیت قرار پاتا ہے۔(قران مجید کی بعض آیات کریمہ کی روشنی میں عزت نفس کا تحفظ بھی شریعت کے بنیادی مقاصد میں شامل نظر آتا ہے) اور فی الحقیقت اجتہاد کے دائرے میں بھی یہی مفادات عامہ آتے ہیں کہ ہر زمانے میں انسان کے انہیں بنیادی مفادات حیات کے تحفظ وبقاء کو مقصد بنا کر غیر منصوص احکام میں شریعت کے بتائے ہوئے واضح کلّیات کے دائرے میں رہ کر اجتہاد کیا جاتا ہے۔اس ضمن میں وحیٔ الٰہی اصول وکلّیات کا ذکر کرنے کے بعد اہل ایمان کو اتنی آزادی فراہم کرتی ہے کہ زمان ومکان کی رعایت کے ساتھ مصلحت عامہ کو مدنظر رکھتے ہوئے نئے قوانین وضع کریں یا زیادہ بہتر الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کی منشاء وحی کی کھوج کریں اور صحیح حکم شریعت کا استخراج کریں۔نتیجے کے طور پر ایک ایسا قانون وجود میں آتا ہے جس میں مطلوبہ مصلحت کی پوری پوری رعایت کے پائے جانے کی جدت بھی موجود ہوتی ہے اور کلّیات کی سختی کے ساتھ پابندی کے ساتھ روح دین وروح شریعت کے ساتھ عین مطابقت رکھنے کی وجہ سے اس میں مستند قدامت بھی پائی جاتی ہے۔

علم وبصیرت اور تقوی وطہارت
شرائط اجتہاد یا صفات مجتہد

اجتہاد کی حقیقت کیا ہے؟ دراصل جہاں مآخذ شریعت یعنی قران وسنت (جس میں رسول ﷺ کے اقوال، افعال اور وہ باتیں شامل ہیں جن کی آپ ﷺ نے تصدیق وتائید فرمائی ہے)

خاموش ہیں (اور ظاہر ہے یہ سکوت قصداً کسی مصلحت کے پیش نظر کیا گیا ہوگا) وہاں کتاب وسنت اور شریعت کے حدود ومزاج اور اس کی روح کی گہری سمجھ رکھنے والے بیدار مغز پرہیز گار مسلمانوں کو یہ حق دیا گیا ہے کہ علم وبصیرت کے ساتھ پوری جدوجہد سے کام لیتے ہوئے من جانب اللہ عطا شدہ ملکۂ استنباط واجتہاد کی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ماخذ دین سے حکم شریعت معلوم کریں۔ اسی میں دین و شریعت کی ہمہ گیر عالمگیریت اور دوام تا قیام قیامت کا راز مضمر ہے ورنہ رسول ﷺ کا خاتم النبین ہونا اور شریعت کا ہر زمانے کے لئے قابل انطباق ہونا ہدف کلام بن جائے گا جو کہ فی الحقیقت محال و ناممکن ہے۔ **بایں معنیٰ اجتہاد نام ہے قرآن وسنت کے ازلی وابدی اصولوں کی روشنی میں بندوں کے مصالح کو مدِ نظر رکھتے ہوئے وقت کے تقاضوں کے مطابق حکم شرع معلوم کرنے کا۔** معلوم ہوا کہ انسانی معاشرے کی پیش رفت کو منضبط کرنا بغیر اجتہاد کے مشکل ہی نہیں بلکہ محال ہے۔ پس جو لوگ درک مقاصد، فہم معانی کے ساتھ استنباط واستخراج کا خاص ملکہ رکھتے ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ ملکی عادات، رسوم ورواج، زبانی محاورات ومقاصد شریعت پر گہری نظر رکھتے ہوں اور اس پر مستزاد یہ کہ تقویٰ و پرہیز گاری، خوف خدا اور اخلاص وللّٰہیت میں فائق تر ہوں وہ یہ حق رکھتے ہیں کہ اجتہاد کریں اور دین کو ہر زمانے کے لئے قابل انطباق وقابل عمل ثابت کریں۔

اجتہاد کا ایک اور پہلو بھی خاص توجہ چاہتا ہے۔ وہ یہ کہ قدیم صالح اور جدید نافع کے درمیان توافق پیدا کیا جائے اور دوریوں کو پاٹا جائے۔ بابِ اجتہاد کے کم سے کم عملاً مقفل ہونے سے مسلم معاشرے کی ثقافتی تخلیقیت شل ہوگئی۔ لغات میں ترقی ووسعت پیدا نہ ہونے کی وجہ سے زبان اور اس کی مخصوص اصطلاحات کا دامن اتنا وسیع نہ ہوسکا کہ بدلتے ہوئے حالات کو اپنے معانی ومفاہیم کے سائے میں سما سکیں۔ اس کا اثر نہ صرف تشریع وقانون سازی بلکہ سماجی اصلاح پر بھی پڑا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اجتہاد کا براہِ راست میدان اسلامی فقہ ہے۔ فقہ اور زبان کا آپسی تعلق بہت اہمیت کا حامل ہے۔ فقہ اور زبان (عربی) کا یہ باہمی تعلق تاریخی اور جغرافیائی ہے۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ میں جو ثقافت وجود میں آئی اور جو کشمکش آج بھی مغربی ثقافت اور تہذیب وتمدن کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کو درپیش ہے اس کا سامنا اولین مسلمانوں نے قانون شریعت کی گہرائی اور گیرائی اور عربی زبان کی فصاحت وبلاغت سے کیا۔ تہذیب وتمدن زبان کے راستے سے در آتے ہیں۔ اس لئے

ضروری ہے کہ اسلامی نشاۃ ثانیہ کیلئے فقہ اور لغت کو اجتہاد کے ذریعے اپنی فطری قوتوں کو بروئے کار لانے کا موقع دیا جائے۔

اجتہاد کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعے مجتہد کسی معلوم حالت میں اللہ تعالیٰ کی مرضی کو جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لئے کسی خاص حالت میں اللہ کی مرضی وہی ہے جس نتیجے ہر مجتہد محنت شاقہ کے بعد پہنچا ہے۔ یہ بات بہت وسیع معنیٰ رکھتی ہے۔ بایں وجہ مجتہد کے لئے بہت اعلیٰ علمی معیار اور بہت ہی بلند اخلاق وکردار اور تقویٰ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور پھر جب یہ معلوم ہو چکا کہ فی الوقت مرضیٔ الٰہی یوں ہے یا یوں ہی ہونی چاہیے تو اس وقت مجتہد کیلئے ہرگز جائز نہیں ہوتا کہ اپنی تحقیق کے نتائج سے گریز کرے یہاں تک کہ دوسرے مجتہدین کی آراء بھی جب موافقت کرتی ہیں تو پھر یہ اجتہاد حجت کا مقام حاصل کر لیتا ہے۔ اب علم وبصیرت کی روشنی میں اس حجتِ اجتہاد یہ اور وحی الٰہی و سنت ثابتہ میں ایک فرق رہ جاتا ہے کہ اول الذکر میں قطعیت نہیں ہوتی یعنی حق وصواب احتمال خطا کے ساتھ۔ یہی پس منظر ہے فقہی مسالک کا اور یہی حقیقت ہے مسلکی اختلافات کی۔ میرا مسلک حق ہے مگر اس میں کہیں خطا کا امکان بھی ہے کیونکہ یہ انسانوں کی عملی جدوجہد کا نتیجہ ہے اور دوسرے کا مسلک اگرچہ میرے مسلک کی روشنی میں مبنی برصواب نہیں مگر اس میں حق ہونے کا پورا پورا احتمال موجود ہے کیونکہ معتبر انسانوں نے اعلیٰ علمی واخلاقی صلاحیتوں سے متصف ہوکر ان نتائج تک رسائی حاصل کر لی ہے۔ یہاں پہنچ کر مسلکی تعصب کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ آج ہمارا مسئلہ اگر ہے تو بس کم علمی کا! اس کے برعکس وحی الٰہی اور سنت ثابتہ قطعی وحتمی ہوتی ہیں۔

معلوم ہوا کہ اجتہاد کے ہرگز یہ معنیٰ نہیں کہ مخصوص خواہشات نفس کی پیروی کرنے والوں اور عقل کے گھوڑے دوڑانے والوں کو چون وچرا اور لاونعم کا دروازہ کھولنے کا موقع ہاتھ آجائے اور عقلاء کو اپنی عقل کے بھروسے پر اور بے علموں کو اہل علم ہونے کی غلط فہمی میں دین کو تختہ مشق بنا لینے کا موقع فراہم کر کے دین میں شدہ شدہ اختلافات پیدا کرنے کا منحوس راستہ کھولا جائے۔ (تفصیل کے لئے ترجمان السنہ از مولانا بدر عالم میرٹھی قلمبند علامہ انور شاہ کشمیری مطبوعہ کراچی ۲۰۰۱ء ج ۱، ۴۰۔۳۸ اور اسلام کے بارے میں ''سو سوال'' از محمد غزالیؒ ترجمہ ابو مسعود اظہر ندوی مطبوعہ دہلی ۲۰۰۳ء ص ۸۰۔۲۷۷) کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔

مسلمانوں کا عروج وزوال اجتہاد کے ساتھ منسلک ہے

حاصل کلام یہ نکلا کہ یہ علم ودانش اور تقوی وطہارت جیسے کارگر اور دیرپا ہتھیاروں سے لیس ہو کر کی جانے والی جہد مسلسل جس کا اصطلاحی نام اجتہاد ہے نہ صرف مسلمانوں کی دینی وروحانی زندگی کی بقا کی ضامن ہے بلکہ ان کی دنیاوی و مادی ضروریات کا تکفل بھی اسی میں پوشیدہ ہے۔ یہ اجمال ذرا سی تفصیل چاہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو بے شمار مادی وسائل سے مالا مال کیا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ انسان کو ان وسائل سے متمتع ہونے اور اپنی بقائے حیات کیلئے فائدہ اُٹھانے کی قوت وصلاحیت کا خوب موقع بھی فراہم کیا ہے۔ اگر انسان اپنی ذہنی وجسمانی صلاحیتوں کو ضابطے کے ساتھ استعمال کرے تو ان مادی وسائل سے خوب فائدہ حاصل کر کے تسخیر کائنات جیسے عظیم کارنامے سے سرفراز ہو جائے۔ تاریخ شاہد ہے کہ بالکل یہی صورت حال مسلمانوں کے ساتھ صدر اوّل میں پیش آئی۔ جب تک قرونِ اولیٰ کے مسلمان قرآن وسنت کی روشنی میں اپنے روحانی و مادّی مسائل کا حل ڈھونڈتے رہے تب تک اُن کو نہ صرف یہ کہ ان مسائل کا حل بروقت ملتا رہا بلکہ وہ اغیار کی نظروں میں بھی معزز، سربلند اور سرفراز زندہ گی گزارتے رہے۔ گویا دنیا کی مادّی قوتوں پر بھی انہی حضرات کی بالادستی رہی۔ مشہور عالم دین اور فقیہہ شیخ شلتوت لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پردہ فرمانے کے بعد صحابہ کرامؓ کو وسیع تر زندگی سے سابقہ پڑا۔ نت نئے حالات میں جدید طرح کے معاملات کے بارہ میں وہ قران کی طرف رجوع کرتے تھے۔ وہاں حکم شرع نہ پاتے تو اس صورت میں رسول ﷺ کی روایات اور فیصلے ڈھونڈتے۔ وہاں بھی اگر مقدور بھر کوشش کے بعد حکم نہ ملتا تو شریعت کی روح اور اس کے مقاصد اور عام قواعد کی روشنی میں حل تلاش کرتے۔ خلیفہ اولؓ ودومؓ کے ادوار میں بھی عام طور پر نبی ﷺ سے منقول روایات کی شدید جستجو کی جاتی تھی پھر جو اشخاص صائب الرائے، بصیرت اور مصالح کا گہرا شعور رکھنے کے ساتھ ساتھ روح شریعت کے شناسا اور عام قواعد پر حکم شرع کو تطبیق دینے میں مہارت رکھتے ہوتے ان سے مشورہ کیا جاتا اور اتفاق رائے سے فیصلہ نافذ کیا جاتا۔ شوریٰ کا حکم تو خود قران حکیم نے فرمایا و امرھم شوریٰ بینھم (الشوریٰ ۱۳۸) یعنی وہ صحابہ کرامؓ اپنے امور آپسی مشورے سے چلاتے تھے۔ مسلمانوں کی اولین تاریخ میں یہی اجتماعی اجتہاد کی صورت ہوا کرتی تھی۔ نبی کریم ﷺ جن کبار صحابہ کو دور دراز علاقوں کے ذمہ دار بنا کر روانہ

فرماتے تھے انہیں بھی یہی ہدایات دیتے تھے کی قران وسنت کے حکم صریح کے نہ ملنے کی صورت میں اجتہاد سے کام لیا کریں۔ حضرت معاذ بن جبلؓ کا واقعہ اس ضمن میں بہت زیادہ شہرت پا چکا ہے جب کہ انہیں یمن کا گورنر بنا کر روانا فرمایا گیا تھا۔ (دیکھئے اسلام کے بارہ میں سوسوال ۷۹۔۲۷۸)۔

علامہ اقبالؒ نے بھی اجتہاد کی ضرورت اور اہمیت اور **(legitimacy)** کو ثابت کرنے کے لئے **Reconstruction** میں حضرت معاذ بن جبلؓ کے واقعہ کو نقل کیا۔ اگر چہ کچھ علماء نے اس واقعے کی تاریخی حقیقت پر کلام کیا بایں ہمہ اس سے ثابت ہونے والے عمل اجتہاد اور اس کے اسلوب سے کسی کو انکار نہیں۔

خلفائے راشدین کے بعد بادشاہی نظام رائج ہوا۔ یہ بڑی ستم ظریفی کی بات ہے کہ بنوامیہ ہوں یا بنوعباس معدودے چند اشخاص کے جن میں سرفہرست عمر ثانی عمر بن عبدالعزیزؒ کی عظیم وعادل شخصیت تھی کے بعد کسی میں قابلیت وصلاحیت نہ دیکھی گئی جس کی بدولت مسلمان دنیا کے مادی وسائل سے بھرپور فائدہ حاصل کر سکتے۔ نتیجے کے طور پر گردش ایام نے وہ مناظر دکھائے کہ ان نعمتوں پر غیروں نے قبضہ جما لیا اور پھر اپنے روحانی اندھے پن کی وجہ سے پیشوایانِ اغیار نے پوری انسانیت کو گمراہی کے عمیق گڑھے میں پھینک دیا۔ دراصل اسی ستم ظریفی کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے سامنے یورپ، یورپ کے مادی نظریات زندگی اور ان نظریات کی بنیاد پر قائم مادی زندگی کے عروج کی وجہ سے جاہلیت قدیمہ اپنی جدید شکل میں از سر نو پورے آب وتاب کے ساتھ جلوہ افروز ہے۔

مسلم حکمرانوں کی علمی و روحانی بے بضاعتی کا نتیجہ یہ ہوا کہ امور سلطنت کو دینی لیبل چڑھانے کی خاطر علماء سے سند جواز حاصل کرنی پڑی جس سے بیک وقت دو گونہ اثرات مرتب ہوئے۔ ایک طرف حکمرانوں نے علماء کے صرف ان ہی اوامر پر عمل کیا اور صرف ان ہی نواہی سے اجتناب کیا جن پر عمل اور جن سے اجتناب سے ان کی خواہشات نفسانیہ پر کوئی زد نہ پڑتی تھی۔ دوسری طرف علماء کی ایک مخصوص ربّانی تعداد کو چھوڑ کر ایک معتد بہ تعداد سرکاری بن گئی۔ حکمران طبقے کے جور وجفا میں انہوں نے قرآن وسنت میں ناروا تاویلات سے کام لیا۔ ان لوگوں کے عقائد طاقت کے اشاروں پر گھومتے رہے۔ نوبت بہ اینجا رسید کہ اغیار کو یہ کہنے کا خوب موقع ہاتھ آیا کہ مسلمانوں کے زوال کی اصل وجہ ان کا عقیدہ ہے۔ اس طرح خلق کثیر کو دین حق سے بعد پیدا ہوا۔ یہ مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ

فلسفہ دورِ تعیش ،ذہنی آوارہ گی اور بے عملی و کاہلی میں پنپتا ہے ۔جب کہ ٹھوس علم جفاکشی ،فکر ونظر کی پاکیزگی اور عملی جدوجہد سے نمو پاتا ہے اور پھر ان ہی صفات کو نمو بخشتا ہے۔اسلام جب عرب سے ہوکر عجم میں پھیلا اور چنگ ورباب کو حکمرانوں کے درباروں میں دادملنی شروع ہوگئی تو علمی مجالس کی جگہ فلسفیانہ نکتہ سنجیوں نے اور عملی جدوجہد جو علم نافع سے پیدا ہوتی ہے کی جگہ فضول متکلمانہ بحثوں نے لے لی۔چونکہ دورِ حکمرانی دورِ طاؤس ورباب ہوتا ہے اس لئے ٹھیٹھ علمی مشغلے اور تحقیقی اسپرٹ کی جگہ فلسفیانہ موشگافیوں نے لے لی۔جہاد بالقرآن کی راہ مسدود ہوگئی اور قرآن وسنت کے مسلمہ حقائق کی جگہ بے بنیاد روایات نے لے لی اور امت فلسفیانہ مابعد الطبیعاتی خرافات میں کھوگئی۔خیر ان حالات میں بھی اللہ تعالیٰ کی مشیّت کارفرما و کارساز رہی اور دورِ عروج کی طرح اس دورِ زوال میں بھی کچھ مردانِ آہن اپنی اپنی انفرادی سطحوں پر دین وشریعت کے کام آتے رہے۔انہوں نے جہاد اور اجتہاد سے برابر کام لیا اگرچہ اجتماعی سطح پر یہ کام پہلے ہی بند ہو چکا تھا۔کاش حکمرانوں نے شورائیت اور عملی استنباط واجتہاد کی دل کھول کر پذیرائی کی ہوتی تو مسلمانوں کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔

جس سلطنت وحکومت کی بنیاد علم کے بجائے طاقت پر ہوتی ہے اس کے دن بھی بہت تھوڑے ہوتے ہیں۔چشم فلک نے یہ ماجرا بھی دیکھا کہ تاتاریوں نے بغداد پر یورش کی۔اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور ۱۲۵۸ء میں بغداد پر قبضہ جما کر دجلہ وفرات کو مسلمانوں کے خون سے رنگین کیا۔اس پریشان کن اور سراسیمگی کے ماحول میں علماء وحکماء سب نے اسی میں عافیت سمجھی کہ اب مزید کسی اجتہاد کی ضرورت نہیں بلکہ جتنا کچھ اسلاف نے کر رکھا ہے اسی پر اکتفا کیا جائے اور گوشۂ عافیت میں رہا جائے۔جدید دور کے اسلامی مفکر محمد غزالی اسے ایک قابل قبول عذر تسلیم کرتے ہیں ان کے نزدیک ایسا طرزِ عمل صرف فتنے کی آگ کو بجھانے کی غرض سے کیا گیا۔جب حکومت کی طرف سے اجتماعی اجتہاد کو جاری نہ رکھا گیا تو دین وشریعت سے بے خبر ہر کس وناکس بھی اسی امید میں کودنے لگا اور مخلص لوگوں سے زیادہ زرخرید لوگ ہی اجتہاد کی صدائیں بلند کرنے لگے۔تب اہل دانش نے اس رجحان کی روک تھام کرنے کی غرض سے ایسی آوازوں کو اہمیت دینا بند کر دیا۔(دیکھئے سوسوال محولہ بالا ۲۸۰)

یوں باب اجتہاد نظریاتی طور نہ سہی پر عملاً آنے والی صدیوں کے لئے مقفل ہوگیا۔تاتاریوں کی بربریت کو عثمانی ترکوں کی فتوحات نے ختم کر دیا لیکن بہرحال اس دوران مغرب کی مادی قوت بہت

مضبوط ہوچکی تھی جس کا سامنا خلافت عثمانیہ نہ کرسکی۔نتیجے کے طور پر میدان مغرب کی ستیزہ کاری کے لئے صاف ہوگیا۔مسلمان مغرب کے غلام ہوگئے۔دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ بدل گیا۔اب قرونِ اولیٰ کے مسلمان کے عشق ومستی کی جگہ قرونِ وسطیٰ کی افسردگی اور عیش کوشی نے ،قوت وحرکت کی جگہ اضمحلال وجمود نے ،رفعت وعروج کی جگہ پستی وتنزل نے اور جہاد اور اجتہاد کی جگہ کاہلت وتساہل ،فکری افلاس اور مغرب کی اندھی تقلید نے لے لی۔بایں ہمہ مغرب کی استیلاء نے اپنے تمام منفی اثرات کے باوجود ایک مثبت اثر یہ ڈالنا شروع کیا کہ مسلمان خواب غفلت سے بیدار ہونے لگے۔

چنانچہ ماضی کی طرح انیسویں صدی میں عالم اسلام کے افق پر چند عالمگیر اثرات کی حامل شخصیات نمودار ہوئیں جن کے افکار وافعال نے ایسے برگ وبار لائے کہ بیسویں صدی میں عظیم دینی تحریکات وجود میں آئیں جنہوں نے ملت کے جوان کے بدن میں موجود روحِ محمدی ﷺ کو مہمیز دی۔چنانچہ اسلام کو دورِ جدید کے ساتھ ہم آہنگ اور نئے تناظر میں قابل انطباق ہونے کی حیثیت میں پیش کرنے والی عظیم شخصیات میں قابل ذکر شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ،سید جمال الدین افغانیؒ ،ان کے شاگرد شیخ محمد عبدہٗ ،سید احمد خانؒ ،مولانا الیاسؒ اور مولانا مودودیؒ وغیرہ اور تحریکات میں الاخوان المسلمون (مصر) جماعت اسلامی (ہند) اور اسلامی کلچر وثقافت اور اتباع سنت کا خاموشی کے ساتھ از سرنو احیاء کرنے میں ''تبلیغی جماعت''[1] قابل ذکر ہیں۔

علامہ اقبالؒ کا شمار ان ہی نابغۂ روزگار شخصیات میں ہوتا ہے جنہوں نے ملت اسلامیہ کو عموماً اور مسلمانانِ ہند کو خصوصاً خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے اپنی سوچ اور فکر اور سعی وعمل کو وقف کیا تھا۔انہوں نے ۲۹۔۱۹۲۸ء میں مدراس ،حیدرآباد اور علی گڈھ میں چھ تفصیلی خطبات دئے جن کا موضوع ہی فکر اسلامی کی تشکیل نو تھا۔بعد میں یہ خطبات انگریزی زبان میں (The ***Reconstruction of Religious Thought in Islam***) کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔

---

[1] یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ''تبلیغی جماعت'' نام عوام وخواص میں بہ آسانی بولا جاتا ہے۔جبکہ درحقیقت اس تحریک کا کوئی نام اسکے شروع کرنے والوں نے نہیں دیا ہے۔مولانا الیاسؒ کہا کرتے تھے کہ اگر میں اس کا کوئی نام رکھتا تو ''**تحریک ایمان**'' رکھتا۔

حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ ایک عبقری شخصیت کے مالک تھے۔ان کے فکر وخیال کی معنویت **(relevence)** ہر زمانے میں محسوس کی جائے گی۔اس کے باوجود چونکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی بھی شخص کی فکر وسوچ کتنی ہی دور رس کیوں نہ ہوا پنے زمانے اور ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔اسی لئے علامہؒ کے **thought** کو بھی اس وقت کے تناظر اور پس منظر میں دیکھنا ضروری ہے جس وقت انہوں نے مسلمانوں کی حالت زار کو اپنے دل کے اندر درد و کڑھن کے ساتھ محسوس کیا تھا۔

علامہ اقبالؒ کی وفات ۱۹۳۸ء میں ہوئی انہوں نے عثمانیوں پر کوہِ غم اپنی چشم بینا سے ٹوٹتا ہوا دیکھا تھا۔مغربی فکر وفلسفہ اور علوم وفنون کی بالا دستی اور ممالک اسلامیہ پر مغربی افکار ونظریات کے استیلاء نے ان کے قلب کو یقیناً بے چین کر دیا تھا۔

اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہے کہ اصل میں یہ ملتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا غم ہی ہے جو ایک مخلص اور راسخ العقیدہ مسلمان کو اس ملت مرحومہ کے زوال واضمحلال کے پس پردہ عوامل کی کھوج لگانے کے لئے کمر بستہ کر دیتا ہے اور پھر ان اسباب وعلل کے معلوم ہو جانے کے بعد وہ علاج تجویز کرنے کی تگ ودو بھی کرتا ہے

مسلمانوں کے عروج وزوال ہر دوادوار کی داستانیں حیران کن ہیں۔اس حیرانگی کی وجہ کیا ہے؟اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ ایک ایسی حقیقت کی پردہ کشائی کرتی ہے جو ہر دور میں مسلمانوں کے زوال کے اسباب اور ان کے ازسرنو عروج کے لئے واضح لائحہ عمل متعین کرتی ہے۔وہ حقیقت یہ ہے کہ عرب کے ناقابل تذکرہ ناہنجاروں کو آناً فاناً میں کرۂ ارضی کی سلطانی سے اگر کسی چیز نے نوازا ہے تو وہ صرف قرآن حکیم ہے۔قرآن سے ان کی وفاداری میں ہی ان کی جہان بینی و جہانداری کا راز مضمر تھا۔اس حقیقت پر مہر ثبت کرنے والی یہ حدیث ''ان اللہ یر فع بھذا الکتاب اقواما و یضع بہ آخرین ' ' کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو اپنا امام ورہنما بنانے والی قوم کو بلند اسے پس پشت ڈالنے والی قوموں کو پست وذلیل کرتا رہے گا ہمیشہ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لئے رہنما خطوط متعین کرتی رہے گی۔اسی طرح آب زر سے رقم کر دئے جانے کے لائق یہ الفاظ جنہیں سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے علاوہ امام دارالہجرت مالک بن انسؒ کی طرف بھی منسوب کیا جاتا ہے کہ ''لن یصلح اخر ھٰذہ المتہ الا مااصلح اولھا ' ' یعنی اس امت کے آخری دور میں بھی اصلاح صرف اور صرف اسی سے ممکن ہے جس سے کہ اس کے دور اول میں ہوئی تھی اس بات کی شہادت پیش کرتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کے عروج کا ضامن انکا براہ راست قرآن سے تعلق تھا تو ان کا زوال بھی مہجوری از قرآن کی وجہ سے رونما ہوا

ہے معلوم ہوا کہ ازسرنو ان کا عروج بھی رجوع الی القرآن کے بغیر محال وناممکن ہے

برصغیر میں بالخصوص امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے جو عظیم کارنامہ انجام دیا وہ یہی تھا کہ انہوں نے امت کو ازسرنو قرآن حکیم کے علم وحکمت کی جانب منعطف کر دیا۔یہی آپؒ کی اجتہادی فکر کا سب سے بڑا کارنامہ تھا۔شاہ صاحبؒ کی اجتہادی فکر وسعی کا اقبالؒ کی فکر پر گہرا اثر رونما ہوا ہے۔اقبال کی فکرِ اجتہاد کا لُب لُباب بھی یہی ہے کہ امت کی روحانی و مادی زوال کے پیچھے اصل سبب اس کے اصل سرچشمۂ حیات قرآن حکیم سے دوری ہے اور مسلمانوں کے زوال کی بنیادی وجہ قرآن سے اپنے مسائل ومشکلات کا حل مستنبط کرنے کے بجائے تقلید جامد کا شکار ہونا ہے۔اگر چہ شاہ ولی اللہؒ اور اقبالؒ کے مابین تفاوت یہ ہے کہ ایک طرف شاہ ولی اللہؒ خود مجتہد ہیں اور انہوں نے ایک مجتہد منتسب یا مجتہد فی المذاہب کی حیثیت سے اپنا کام جاری رکھا جبکہ دوسری طرف اقبالؒ مجتہد نہ تھے بلکہ آپ صحیح معنوں میں ایک ضابطے کے عالم دین بھی نہ تھے۔ہاں آپ مسائل کا صحیح ادراک رکھتے تھے۔جاہلیت جدیدہ کے مہلک اثرات سے واقف تھے،ایک ماہر نباض تھے اور شریعت اسلامیہ میں امت کے درد کی دوا موجود ہونے پر یقین رکھتے تھے۔فضل خداوندی نے آپ کے لئے یہ بھی مقدر کیا تھا کہ آپ کو اپنے دور کے بڑے بڑے جید علماء کے برعکس مغربی تہذیب و تمدن کو نزدیک سے دیکھنے پرکھنے اور مغرب کی فضا میں سانس لینے کا موقع ملا۔آپ طوفان مغرب سے سلامتیٔ ایمان کے ساتھ نکل آئے۔

شاہ صاحبؒ اور علامہؒ کے افکار میں اہم آہنگی اور بھی ہے۔شاہ صاحب کسی متعین امام فقہ کے تمام اقوال کو تسلیم کرنے کو قرآن اور سنت پرتب تک اعتماد نہ کرنے کو جب تک اسے اس متعین امام کے قول کی طرف پھیرا نہ جائے مذموم قرار دیتے ہیں مگر اس کے باوجود آپ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کرتے کہ چاروں مسالک حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی میں سے کسی ایک کی تقلید کرنا موجودہ زمانے کی ضرورت بھی ہے اور مصلحت بھی۔آپ اپنی شہرۂ آفاق تصنیف **حجة الله البالغة** کے باب (۷۴) **حكاية حال الناس من قبل المأة الربعة و بعدها** (چوتھی صدی سے پہلے اور بعد کے لوگوں کے حالات) کے ذیل میں لکھتے ہیں:

''ان ھذہ المذاھب الا ربعة المدونة المحررة قد اجتمعت الامة او من یعتد به منها علی جواز تقلید ھا الی یومنا ھذا وفی ذالک من المصالح ملا یحفیٰ لا سیما فی ھذہ الایام التی قصرت فیھاالھمم جداواشریت النفوس الھوی و

اعجب کل ذی رائی برایه "

''یہ چار مذاہب فقہ جو مدون ہو چکے ہیں ان کے بارے میں امت کا یا (یوں کہیے) متعد بہ لوگوں کا اجماع ہو چکا ہے کہ ان کی تقلید جائز ہے کیونکہ اس میں بہت سی مصلحتیں مخفی ہیں خصوصاً اس زمانے میں لوگوں کی ہمتیں بہت پست ہوگئی ہیں اور خواہشات نفسانی کا غلبہ ہوگیا ہے اور ہر آدمی اپنی رائے پر ناز کر رہا ہے''

اپنی دوسری تصنیف عقد الجید میں لکھتے ہیں:

''انما اندرست المذاهب الحقة الا هٰذه الاربعة كان اتباعها للسواد الاعظم والخروج عنها خروجا عن السواد الاعظم''

''جب ان چار مذاہب حقہ (مسالک فقہ) کے علاوہ دیگر مذاہب (مسالک) مٹ گئے تو انہی کی اتباع سے سواد اعظم کی اتباع ہوگی اوران سے خروج سواد اعظم سے خروج ہوگا''۔ ٹھیک اسی طرح اگرچہ علامہؒ اجتہاد مطلق **(Absolute Ijtihad)** کے عملاً بند ہونے کو زوال کا بنیادی سبب قرار دیتے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی آپ مسلمانوں کے سیاسی زوال کے دوران انہی چار فقہی مسالک کے اندر محصور ہو جانے کو اس وقت کے علماء کا قابل قبول عذر تسلیم کرتے ہیں اگرچہ آپ اس عذر کو تسلیم کر لینے میں قدرے محتاط نظر آتے ہیں:

(Reconstruction) کے چھٹے لیکچر میں رقمطراز ہیں:

"On the top of all this came the destruction of Baghdad ....this was indeed a great blow....for fear of further disintegration,which is only natural in such a period of political decay,the conservative thinkers of Islam focussed all the efforts on the one point of preserving a uniform sociallife for the people by a jealous exculsion of all innovations in the law of shariat as expounded by the early doctors of slam.Their leading idea was social order,and there is no doubt that they were partly right,because organisation does to certain extent counter the forces of decay"

گویا آپ سیاسی استحکام اور افراتفری کے عالم میں مسلمانوں کی شیرازہ بندی اور نظم وضبط کے لئے تقلید ائمہ مجتہدین کو کسی حد تک وقت کی ضرورت محسوس کرتے ہیں ۔سیاسی غلامی جب فکری غلامی پر منتج ہوجاتی ہے تو تنگ نظری پیدا ہوجاتی ہے تب تقلید سلف صالح کی ضرورت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔علامہ کا نقطہ نظر یہی ہے کہ ایسے وقت میں نئے اجتہاد سے ماضی کے اجتہاد کی تقلید ہی بہتر ہے ؎

زجتہاد عالمان کم نظر ☆ اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر

اب اس بات میں شک نہیں رہتا کہ اجتہاد مطلق کا دروازہ دراصل بند نہیں ہے ۔ بلکہ ائمہ اربعہ کے بعد مسلمانوں کی پوری تاریخ میں مجتہد مطلق کے معیار کا کوئی شخص پیدا نہیں ہوسکا۔آخر اس حقیقت سے کون آنکھیں بند کرسکتا ہے کہ اجتہاد دلیل چاہتا ہے دعویٰ نہیں ۔مجتہد دعویٰ نہیں کرتا بلکہ اس کا کام خود بہ خود اسکا معیار متعین کرتا ہے ؎

حقیقت ہو تو دل سینوں میں کھچنے لگتے ہیں واعظ
صداقت خود کو منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی

یہ قابل توجہ بات ہے کہ متقدمین ائمہ مجتہدین کے وضع کردہ اصول اتنے جامع و وسیع اور مکمل تھے کہ بعد کے ادوار میں جتنے بھی مسائل پیش آئے علماء اسلام کو ان اصولوں کی روشنی میں کافی وشافی حل مل گیا اور علم واخلاق کے اعلیٰ معیارات پر فائز ہونے کے باوجود مجتہدین متاخرین کو ان اصولوں کو اپنے اجتہادات کا دائرہ کار بنانے کی چنداں ضرورت نہ پڑی ۔نتیجے کے طور پر ائمہ اربعہ کے بعد جتنی بھی چوٹی کی علمی شخصیات مجتہدانہ شان کی پیدا ہوئیں وہ تقریباً سب اپنے اپنے مسالک کے دائرے میں ہی رہیں۔زیادہ سے زیادہ کسی مسلک کے اصول وکلیات سے کسی پیش آمدہ جدید مسئلہ کا حل نہیں مل سکتا تھا تو دوسرے مسلک کی طرف رجوع کیا جاتا اور ایسا اب بھی ہورہا ہے۔

گویا مطلق اجتہاد کی تب ضرورت پڑتی ہے جب نئے اصول وضوابط وضع کرنے کی ضرورت پڑے جب کہ مقید اور محدود اجتہاد ہر دور میں جاری رہا ہے۔ یہ حقیقت اظہر من الشّمس ہے کہ بیسویں صدی کے تقریباً تمام مفکرین اور دینی تحریکات پر اپنے افکار ونظریات کی چھاپ ڈالنے والے ابن تیمیہؒ بھی مجتہد مطلق کی حیثیت سے سامنے نہ آسکے ۔اگرچہ بعض حضرات نے انھیں مجتہد مطلق مانا ہے مگر حق یہ ہے کہ ان کا اپنا کوئی الگ فقہی سکول رائج نہ ہوا۔فی الحقیقت آپ اصول فقہ میں احمد بن

حنبلؒ کے مقلد تھے اور مجتہد فی المذہب کی حیثیت سے اپنے تفردات بھی رکھتے تھے۔

گویا اگر چہ باب اجتہاد تا قیام قیامت کھلا ہے اور پیش آمدہ غیر منصوص مسائل میں اجتہاد کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں مگر یہ کام ہر کہ ومہ کا بھی نہیں۔ ایسے لوگ تو شوق اجتہاد میں اجماع امت سے بے نیاز ہو جاتے ہیں اور انہیں پتہ بھی نہیں چلتا کہ کہاں سے کہاں پہنچ گئے اس لئے اجتہاد کے لئے جو کڑی شرائط مانی گئیں ہیں اور مجتہد کے لئے جن صفات سے متصف ہونا ضروری ٹھہرایا گیا ہے وہ شرائط وصفات ایک طرف سے لازمی بھی ہیں مگر دوسری طرف کسی فردِ واحد میں ان صفات کا جمع ہو جانا بعد کے ادوار میں محال نظر آنے لگا۔ بایں وجہ جو کام ناگزیر تھا وہ عملاً ناممکن بنا۔

اس پیچیدہ صورت حال سے خلاصی کی جو راہ اقبالؒ کو سوجھی وہ لائق تحسین بھی ہے اور اہل علم کے لئے بڑی غور طلب بھی۔ آپؒ کسی ایک شخص کے بجائے ایک جماعت میں ان صفات کو ڈھونڈنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ راقم کے نزدیک شاید علامہؒ کی رائے بڑی حد تک امام ابوحنیفہؒ کے طریقہ کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے۔ بعد کے دور میں اورنگ زیب عالمگیرؒ کے زمانے میں فتاویٰ عالمگیری کی تدوین کے طریقے سے بھی اس طرح کا استدلال کیا جا سکتا ہے۔

بہر کیف علامہؒ کو شکایت ہے ان کڑی شرائط کے ساتھ۔ اس ضمن میں وہ خصوصاً اہل سنت و جماعت سے ناراض ہیں کہ اُن کی شرائط نے ضرورت اجتہاد کو کاغذوں میں تو موجود رکھا مگر عملاً ان کے ہاں چار مسالک کے مدون ہو جانے کے بعد کوئی مجتہد مطلق نمودار نہ ہوا کیونکہ ایسی شرائط کا کسی ایک شخص میں پایا جانا آپ کے نزدیک مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا۔

"The principle of Movement in Reconstruction کے چھٹے لیکچر the Structure of Islam" میں لکھتے ہیں:

> *"The theoritical possibility of this degree of Ijtihad is admitted by the Sunnies,but in practice it has always been denied ever since the establishment of the schools in as much as the idea of complete Ijtihad is hedged round by conditions which are well-nigh impossible of realization in a single individual"*

علامہ کی یہ بات تو اپنی جگہ بجا ہے لیکن فی الحقیقت اجتہاد کی معنویت اور اسکا قابل اعتماد اور سودمند ہونا ان سب باتوں کا دارو مدار ضرور کچھ بنیادی شرائط پر ہے جن کو پورا کئے بغیر اسلام میں قانون سازی کا عمل سارا کا سارا غیر اسلامی ہو کر رہ جائے گا۔ کیا یہ کسی طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ اجتہاد وہی لوگ کریں جن کے دلوں میں خود اس دین پر کامل یقین ہی موجود نہ ہو جس دین کی خیر خواہی کیلئے وہ اجتہاد کرنے کے خواہشمند ہیں؟ کیا دین کے بنیادی ماخذ یعنی قرآن وسنت کو عربی زبان کو جانے بغیر کوئی اور پہلا اور بنیادی ذریعہ ہو سکتا ہے؟ کیا خوف خدا اور اسلامی معیار سے گرے ہوئے افراد سے مخلصانہ اجتہاد کی توقع رکھی جا سکتی ہے؟ کیا جو اجتہاد اعلیٰ اسلامی کردار سے عاری، بے علم اور مشتبہ نیت و اخلاص کے لوگ کرینگے اُسے مسلمانوں کے حلق سے اُتارا جا سکتا ہے۔ (ملاحظہ ہو مولانا مودودی، تفہیمات جلد ۳، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ۱۹۸۹ص ۱۹۔۱۸)

درحقیقت تقویٰ، تزکیہ نفس۔ للّٰہیت اور مخلوق سے بے نیازی ایسی اہم صفات ہیں جن کے بغیر اجتہاد جیسا جوئے شیر لے آنے والا کار عظیم کیا صرف نقل علم کی شفافیت سے بھی اعتماد اُٹھ جاتا ہے۔

یہاں پر مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم کے الفاظ کو من وعن نقل کرنا مناسب اور ازحد ضروری معلوم ہوتا ہے۔ آپ لکھتے ہے:

''آپ غور کیجئے تو درحقیقت ہم اسی صورتحال سے دو چار ہیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ لوگ اجتہاد کو کوئی کفر اور تقلید کو کوئی جز و ایمان سمجھتے ہیں۔ اگر ایسے لوگ ہیں بھی تو ان کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ اصلی چیز یہی ہے کی اس زمانہ میں جو لوگ اجتہاد کے مدعی بن کر کھڑے ہوتے ہیں لوگوں کی نگاہوں میں ان کے علم کا کوئی وزن قائم ہوتا ہے نہ ان کے تقویٰ کا۔ لوگ مجتہد کے اندر امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور امام شافعیؒ کے سیرتوں کے پرتو ڈھونڈتے ہیں اور امام ابن تیمیہؒ کی عزیمت اور شاہ ولی اللہؒ کا تقدس تلاش کرتے ہیں اس تلاش میں لوگ حق بجانب بھی ہیں۔ آخر وہ ان لوگوں کے اجتہادات پر کس طرح اعتماد کر لیں جن کو وہ دنیا کی خاطر ہر چیز کو فروخت کرتے ہوئے اپنے آنکھوں سے دیکھتے ہیں''۔ (اسلامی قانون کی تدوین از امین احسن اصلاحی، قرآن وسنت اکیڈمی دہلی ۲۰۰۶ء ص ۶۴۔۶۵)

اس طرح کی حوصلہ شکن صورت حال میں علامہؒ کا موقف بھی لچک دار دکھائی دیتا ہے۔ اقبال

کے خیال کے مطابق ہر ایسے دور بے کس میں جب حریت فکر مفقود ہو یا جب فکری افراتفری اور بے ذوقی کا دور دورہ ہو جس سے ملت اسلامیہ کی مرکزیت اور شریعت کے حدود پامال ہو رہے ہوں تو قدیم فقہی سرمایہ کو سنبھالے رکھنا بھی اولوالعزمی ہے۔ انہی حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آپ ۱۹۱۸ء میں ''رموزِ بے خودی'' میں ملت اسلامیہ سے یوں مخاطب ہیں ۔

عہد حاضر فتنہ ہا زیر سر است ☆ طبع ناپروائے او آفت گر است
مضمحل گردد چو تقویمِ حیات ☆ ملت از تقلید می گیرد ثبات
راہِ آبا رو کہ ایں جمعیت است ☆ معنیٔ تقلید ضبطِ ملت است
در خزاں اے بے نصیب از برگ و بار ☆ از شجر مگسل بامید بہار
نقش بر دل معنیٔ توحید کن ☆ چارۂ کارِ خود را تقلید کن
اجتہاد اندر زمانِ انحاط ☆ قوم را برہم ہمی پیچد بساط
ز جتہادِ عالمانِ کم نظر ☆ اقتداء بر رفتگان محفوظ تر

''درج بالا اشعار سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ اقبالؒ نے فکری انحطاط کے زمانے میں ملت کو یہی ترغیب دی ہے کہ وہ اپنے تاریخی، تمدنی، فکری اور فقہی سرمائے سے سختی کے ساتھ وابستہ رہیں کیونکہ ان حالات میں ملت کے لئے اتباع سلف کی کامل تقلید میں ہی عافیت کا راز مضمر ہوتا ہے''

شاید اسی لئے علامہ اقبالؒ اپنے خطبات میں انفرادی اجتہاد کے مقابلہ میں شورائی اجتہاد کو زیادہ سودمند اور ممکن العمل خیال کرتے ہیں اور اسی طریقہ کو دورِ جدید میں اجماعِ امت کی سب سے زیادہ موزوں شکل تصور کرتے ہیں آپ لکھتے ہیں:

"The transfer of the power of Ijtihad from individual representatives of schools to a Muslim legislative assembly which,in view of the growth of opposite sects,is the only possible form Ijma can take in modern times,......."(Reconstruction,p.174)

علامہ اقبالؒ کی اجتہادی فکر کی دو اہم ستون ہیں۔ پہلا ستون فقہ اسلامی کی تدوین جدید کا ہے اور

دوسرا مغربی فکر و نظام اور اس کے اثرات سے عالم اسلام میں امنڈتی ہوئی تجدد پسندی پر صحت مند تنقید ۔ جہاں تک فقہ اسلامی کی تدوین جدید کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں علامہ اقبالؒ قانون اسلامی کی از سر نو ترتیب و تدوین کے ساتھ ساتھ موجودہ حالات میں اسے عدالتوں میں قابل نفاذ بنانے کے لئے دفعہ وار مرتب کرنے کے بارے میں فکرمند دکھائی دیتے ہیں۔ آپؒ فرماتے ہیں:

''موجودہ دور میں اسلام کی سب سے بڑی ضرورت فقہ کی تدوین جدید ہے تا کہ زندگی کے اُن سینکڑوں مسائل کا حل پیش کیا جائے جن کو موجودہ قومی، بین الاقوامی، سیاسی، معاشی، اور سماجی ارتقاء نے پیدا کیا ہے''۔ (حیات انور، از: سید محمد از ہر شاہ، قیصر شاہ منزل دیوبند ۱۹۵۵ء ص ۱۶۰، بحوالہ تاریخ دعوت و جہاد از عبید اللہ فلاحی ہندوستان پبلکیشر، دہلی ۲۰۰۶ ص ۳۲۴)

آپ نے آل انڈیا مسلم کانفرنس منعقد لاہور ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء میں اپنے خطبہ صدارت میں تجویز پیش کی تھی:

''علماء کی ایک جماعت قائم کی جائے جس میں ایسے مسلمان قانون دان بھی شامل ہوں جنہوں نے جدید علم قانون کی تعلیم حاصل کی ہو۔ مقصد یہ ہے کہ جدید حالات کی روشنی میں اسلام کے قانون کی حفاظت کی جائے۔ اس کو پھیلا دیا جائے اور بشرطِ ضرورت اس کی از سرنو تشریح کی جائے اس طرح کہ اس کے بنیادی اصولوں کی تہہ میں جو روح کارفرما ہے وہ ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے'' (نفس مصدر)

مادی نظام ہائے زندگی میں اور مغربی علم و فکر پر تنقیدی نظر ڈالنا اقبالؒ کے نزدیک اس لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ یہی طریقہ اسلام کی حقانیت کو ثابت کرنے کا ہے **(Reconstruction)** میں آپ لکھتے ہیں:

"And if we can not make any original contribution to the general thought of Islam,we may,by healthy conservative criticism,serve at least as a check on the rapid movement in the world of Islam"(P.153)

علامہ اقبالؒ ترکوں کی جدت پسندی کو اجتہاد کا نام دے کر ان سے بڑی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ علامہؒ کے ترکوں کے بارے میں موقف میں کلام کی گنجائش موجود ہے تاہم طوالت کے خوف سے اس دیباچے میں اس پر مزید بحث نہیں کی جاسکتی ہے۔

تاہم یہ کہنا بجا ہوگا کہ ترکوں نے اسلامی اصولوں کے خلاف وطنیت کو اپنا شعار قرار دیا ہے اور

شریعت اسلامی کے خلاف اجتہاد کیا۔خاص طور پر انہوں نے عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں میراث کے متعلق فقہ کے متفقہ فیصلوں پر احتجاج کیا۔مگر علامہؒ نے اُن کے ان خیالات کو اسلامی قوانین کی ناواقفیت پر محمول کیا ہے"۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ علامہؒ ترکوں کو شریعت سے ناواقف بھی مانتے ہیں اور ان کے اجتہاد کی طرف داری بھی کرتے ہیں۔

بہر کیف آج علماء ومفکرین کے سامنے بہت بڑا چیلنج ہے۔آج اگر ایک طرف جاہل افکار ونظریات پر زبردست اور صحت مند تنقید کے ذریعہ سے ان کے بطلان کو واضح طور پر ظاہر کرنے کی اشد ضرورت ہے تو دوسری طرف کم سے کم ذہنی وفکری میدان میں اسلام کی حقانیت اور اس کے قابل انطباق ہونے کو ثابت کرنے کی اس سے زیادہ ضرورت ہے۔حقیقت توحید اور حقیقت ختم نبوت کے حتمی مفہوم کا تعین ایک زبردست اجتہادی تحریک کے بغیر ممکن نہیں ہے۔جب تک روح اسلام کے ساتھ وابستگی استوار نہ ہو اور رسوم ورواج کی کورانہ اتباع سے اجتناب و حذر نہ ہو تب تک اسلام کو ایک عالم گیر حقیقت ثابتہ کی حیثیت سے پیش کرنا محال ہے۔آج ہم ایسے دوراہے پر کھڑے ہیں جہاں دو میں سے صرف ایک ہی راستے کا تعین کیا جاسکتا ہے۔یا ہمت مرداں لے کر ایک نئی جد وجہد جس میں اپنی تابناک ماضی سے رشتہ مضبوط رکھتے ہوئے اپنے حال کو اس ***ispiration*** کی روشنی میں چلانا ہوگا اور مستقبل کے لئے لائحہ عمل مرتب کرنا ہوگا۔اس جد وجہد کا انحصار مدد خدا پر ضرور ہوگا ورنہ پھر ضعف وا ضمحلال کی مریضانہ کیفیتوں کے ساتھ صرف مادی وشہوانی زندگی گزارتے ہوئے نفس کے غلاموں کی غلامی کرنی ہوگی۔اس روش کا اختتام مرگ مفاجات کی صورت میں لازماً دیکھنا پڑے گا۔یہ جان کر مسرت ہوتی ہے کہ مسلمانان عالم کا جمود ٹوٹنے لگا اور اقبالؒ اور دوسری سرمایۂ افتخار شخصیات کی کوششوں نے رنگ لایا اور خاص اجتہاد ہی کے موضوع پر بہت ساری کوششیں ہونے لگیں۔مجمع البحوث الاسلامیہ (قاہرہ) میں کئی سمینار اور کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔جن کا موضوع اجتہاد اور فکر اسلامی کی تشکیل جدید رہا ہے۔اسی طرح اس موضوع پر پہلی مؤتمر ۱۹۶۲ء میں ازہر ہیں ہوئی۔کویت میں ہر سال حکومت کے تعاون سے بین الاقوامی سمینار کیا جاتا ہے جس میں دنیا بھر کی مسلم شخصیات حصہ لیتی ہیں۔اس سالانہ سمینار کا موضوع ہوتا ہے "ندوة مستجدات الفكر الاسلامي" یعنی فکر اسلامی کے جدید پہلو۔اسی طرح پروفیسر مشیر الحق مرحوم سابق وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی نے ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے تحت دسمبر ۱۹۸۶ء میں نئی دہلی میں ایک سمینار منعقد کیا تھا جس میں علماء ومفکرین نے مقالات پڑھے

تھے جن کا مجموعہ بعد میں "فکر اسلامی کی تشکیل جدید" کے نام سے جامعہ ملّیہ (نئی دہلی) سے شائع ہوا۔ایسی کوششیں اب بھی جاری ہیں مگر ان کوششوں کے خاطر خواہ نتائج سامنے نہ آنے کی وجہ کیا ہے؟اس کا سبب یہی ہے کہ فکر اسلامی کی تشکیل جدید ایک مجتہدانہ عمل ہے اور جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کی اس وقت دنیا میں کسی ایک فرد میں صفات مجتہدانہ کا پایا جانا بہت مشکل ہے یا زیادہ صحیح طور یوں کہا جاسکتا ہے کہ مسلم دنیا میں ذہنی جمود کی ایسی فضا چھائی ہوئی ہے کہ کوئی بھی شخص اجتہاد کی ہمت کرنے کے لئے تیار نہیں۔(**ملاحظہ ہو "فکر اسلامی کی تشکیل جدید" از مولانا وحید الدین خان مرتب آغا اشرف علی، تابش پبلیکیشنز سری نگر ۱۹۹۹ء ص ۸۴-۸۲**)

اس دوراہے پر کھڑے ایک سرگرداں مسافر کے لئے علامہؒ کی چیخ وپکار کتنی معنی خیز ہے ؎

ہر شئے مسافر ہر چیز راہی ☆ کیا چاند تارے کیا مرغ ماہی
تو مرد میدان تو میر لشکر ☆ نوری حضوری تیرے سپاہی
کچھ قدر تو نے اپنی نہ جانی ☆ یہ بے سوادی یہ کم نگاہی
دنیائے دوں کی کب تک غلامی ☆ یا راہبی کر یا پادشاہی

"یہ حقیقت ہے کہ بیسویں صدی میں اسلام کے احیاء کے لئے ڈاکٹر اقبال کی کاوشیں ناقابل فراموش ہیں اور اپنے پیش روؤں کے مقابلہ میں سب پر بھاری ہیں۔بیسویں صدی کی تمام اسلامی تحریکات نے یہاں سے غذا حاصل کیا ہے" (**تاریخ دعوت وجہاد، ص ۲۹**)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اجتہاد دین اسلام کی اندرونی حرکت وحیات (***principle of inner dynamism***) کے اصول سے عبارت ہے۔اسلام چونکہ اپنی اصل میں دین فطرت ہے اور فطرت اپنی اصل میں متحرک ہے اور متحرک اشیاء کو ہی اپنے ساتھ ہم آہنگ بنا لیتی ہے جبکہ غیر متحرک اور جامد نظریات یا تو زمانے کی رو کے ساتھ بہہ کر اپنی انفرادیت سے دست کش ہو جاتے ہیں یا صفحۂ وجود سے نیست ونابود ہو جاتے ہیں۔مگر اس کے برعکس اسلام کے اصول ابدی ہیں اس دین میں حیات ہے اور اس کے مقدر میں حیات ہی حیات ہے جمود نام کی کوئی چیز نہیں۔اسلام اور ہر زمانے کے ساتھ اس کی ہم آہنگی کا ہی یہ تقاضا رہا ہے کہ اس کی تاریخ میں یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ کوئی دور ایسا نہیں گذرا ہے جس میں کہ لائق وفائق علماء نے اجتہاد سے کام لے کر اپنے اپنے عصری تقاضوں کو اسلام کے ابدی وغیر متبدل اصولوں کی روشنی میں پورا نہ کیا ہو۔

یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے کہ جس طرح اس رب حکیم وعلیم نے دین کی کلیات کو منصوص اور غیر متبدل بنا کر ان ہی کی روشنی میں غیر منصوص اور تغیر پذیر احکام میں اجتہاد کی گنجائش ہمیشہ کیلئے باقی رکھی ۔تقریباً کچھ اسی طرح ائمہ متبوعین کے وضع کردہ اصول اجتہاد بھی ایسے محکم وہمہ گیر بنے کہ آنے والے ہر زمانے کے علماء ومجتہدین نے ان ہی اصولوں کی روشنی میں اجتہاد کیا۔ ہاں اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ جس طرح قرآن وسنت کے منصوص احکام ابدی اور ہر تبدیلی سے منزہ ہیں اس طرح کسی بھی مجتہد کے اصول اجتہاد غیر متبدل نہیں ہو سکتے ۔مگر یہ بھی حقیقت مسلمہ ہی ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔اس لئے آنے والے ادوار ہی یہ طے کر سکتے ہیں کہ جن اصول اجتہاد پر امت متفق ہوتی چلی آرہی ہے۔کیا ان میں کسی طرح کی تبدیلی کی ضرورت پڑتی ہے یا نہیں۔سر دست اتنا تو مسلم ہے کہ وقتی ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے علماء اجتہاد کرتے رہتے ہیں۔

مجتہدین وعلماء کے ہاں یہ اصول مسلم ہے کہ **الاحکام تتغیر بتغییر الزمان** یعنی زمانے کے بدلنے سے غیر منصوص احکام شریعت میں قیاس واجتہاد کی گنجائش برابر رہتی ہے ایسے احکام زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلتے رہتے ہیں ۔مگر سوال یہ ہے کہ تغیر زماں سے کیا مراد ہے اس مسئلے کو سمجھنے کے لئے یہ جاننے کی بہت ضرورت ہے کہ شریعت میں احکام کی بنیاد ان کی مصلحتوں کے بجائے علتوں پر ہے۔شرعی احکام کے واجب التعمیل ہونے کے لازمی سبب کو علت کہا جاتا ہے جب قانون ساز کے پیش نظر جو فائدہ اور حکمت ہوتی ہے اسے مصلحت کہا جاتا ہے۔مثال کے طور پر قرآن مجید میں شراب کو حرام قرار دیا گیا۔علت اس کی یہ ہے کہ لوگ نشے میں مبتلا نہ ہوں ۔مصلحت اس حکم کہ یہ ہے کہ لوگ بہک نہ جائیں کہ بری اور مُباح حرکتیں کرنے لگیں ۔اب اگر کوئی یہ کہے کہ میں شراب پینے کے باوجود قابو میں رہنے کا عادی ہوں تو کیا حکم بدل جائے گا۔نہیں ۔کیوں کہ علت بدستور پائی جاتی ہے۔اس لئے کسی بھی حکم شرعی کے پیچھے علت اور مصلحت کو جاننا بے حد لازم ہے۔ہاں یہ بات ضرور ہے کہ ایک سچے مسلمان کو حکم کی پیروی علت ومصلحت کو چھوڑ کر صرف رضائے الٰہی کے لئے کرنی چاہئے۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ شریعت کے تمام احکام کا مقصد عدل کا قیام ہے اس لئے قرآن وسنت میں عدل کے حقیقی مفہوم کو سمجھنا اور عدل وقسط کے حدود سے پوری طرح باخبر ہونا ضروری ہے۔اللہ تعالیٰ اور اسکے بندوں کے درمیان تعلق میں راہ اعتدال کیا ہے،انسانی،جان،مال،نسل اور عقل کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لئے شریعت نے

جو راہِ اعتدال قائم کیا ہے وہ کیا ہے؟ان اصولوں کو مدنظر رکھے بغیر اجتہاد کسی بھی صورت میں ممکن العمل نہیں ہو سکتا۔ظاہر ہے ان تمام اصولوں سے واقفیت کے لئے راسخ علم اور کمال تقویٰ لازمی صفات ہیں ۔

اجتہاد کا عمل صحابہ کرامؓ کے دور میں ہوتا رہا جبکہ خود نبی کریم ﷺ نے بھی حضرت معاذ بن جبلؓ کو اجتہاد کی اجازت دی۔اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اجتہاد مطلق کا دروازہ بند ہے۔وجہ یہ ہے کہ اب اسکی ضرورت نہیں رہی اس لئے کہ اجتہاد مطلق کے ذریعہ سے جو کام کرنا مطلوب تھا وہ پورا کیا جا چکا ہے ۔اب تحصیل حاصل سے کوئی فائدہ نہیں۔

اس کے بعد اجتہاد کا دوسرا درجہ آتا ہے جسے اجتہاد منتسب کہا جاتا ہے۔اس میں اجتہاد مطلق کے ذریعہ سے وضع کئے جا چکے اصول وکلیات کو سامنے رکھتے ہوئے تفصیلات بیان کی جاتی ہیں ۔جیسے امام ابوحنیفہؒ کے اصول کے مطابق امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نے اجتہاد کیا۔

تیسرا درجہ اجتہاد فی المسائل کا ہے جس میں جزوی مسائل کو معلوم کیا جاتا ہے۔یہ اجتہاد ہمیشہ ہوتا رہے گا جبکہ دوسری درجہ کا اجتہاد منتسب صرف ضرورت کے وقت ہی کیا جائے گا۔

(تفصیل کے لئے دیکھئے محاضرات فقہ از ڈاکٹر محمود احمد غازی ،دہلی ،اریب پبلیکیشنز،۲۰۱۰ء،ص ۳۸۔۳۳۷)

حرف آخر: اجتہاد کے درجات

امت مسلمہ کے شروع کے زمانے میں جو بنیادی کام کرنے کا تھا وہ یہ تھا کہ قرآن مجید اور سنت کے احکام کی تعبیر کرنے کے اصول وضع کئے جائیں ۔تعبیر احکام کا مسئلہ ابتدائی دور کے فقہا کے سامنے تھا۔انہوں نے تعبیر شریعت،فہم شریعت اور تطبیق شریعت سے متعلق بنیادی سوالات کے جوابات تلاش کئے ۔اس دور میں اجتہاد کے ذریعے اصول وکلیات وضع کئے گئے اُس اجتہاد کو اجتہاد مطلق کہا جاتا ہے۔

اقبالؒ اور تقلید ..... ایک تحقیقی جائزہ

(سالک بلال احمد وانی ایم۔اے اسلامیات کشمیر یونیورسٹی)

جہاں تک لفظ تقلید کا تعلق ہے یہ لفظ قَلَدَ باب نَصَرَ سے مشتق ہے لغت میں اس کے ہم معنیٰ الفاظ رفق ،لواہ یا الحبل آئے ہیں اور عربی یہ میں لفظ مختلف طرق سے استعمال ہوتا ہے۔مثلاً عربی میں کہا جاتا ہے ''قلد البعیر''یعنی اونٹ کی گردن میں کھینچنے کے لئے پٹاڈالنا،اسی طرح ''قلدہٗ فی کذا ''یعنی اس نے اس کی فلاں بات میں بغیر غور وفکر کے پیروی کی یا کہا جاتا ہے''قلدہٗ فیما یقول او یفعل من غیرِ حجۃوّلا دلیل '' اس نے اس کے قول وعمل پر بغیر کسی دلیل اور حجت کے عمل کیا ۔اگر ہم صرف لغوی معنوں کی رو سے ہی دیکھیں تو تقلید کرنے کے دو ہی وجوہ ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ مُقلَّد یعنی جس کی تقلید کی جاتی ہے فہم، دیانت ،تقویٰ ،تدین غرض ہر اعتبار سے اتنا قوی ہے کہ مُقلِّد یعنی تقلید کرنے والے کو اس پر عقلی اور نقلی اعتبار سے اعتماد کرنے کے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں لہٰذا وہ یعنی مقلِّد دیانتاً اس کی بات کو ماننا اور اس کی پیروی کرنا اپنے اوپر واجب اور ضروری سمجھتا ہے۔اس قسم کی تقلید شرعاً جائز ہی نہیں بلکہ مستحسن ہے۔دوسری وجہ جہالت پر مبنی ہوسکتی ہے کہ مقلِّد یعنی تقلید کرنے والے کو مقلَّد یعنی جس کی تقلید کی جاتی ہے سے کسی بنا پر اتنا والہانہ عشق ہوا ہے کہ وہ اس کی ہر بات کو چاہئے یا وہ حق ہو یا ناحق اس کے ساتھ صرف قائم شدہ تعلق کی بنیاد پر حق جانتا ہے یہ تقلید شرعی اعتبار سے ممنوع ہے ۔شریعت کی اصطلاح میں تقلید اول الذکر (پہلے ذکر کیا گیا) معنی میں مستعمل ہے۔کیونکہ اس قسم کی تقلید میں اگر بنظر غائر دیکھا جائے بذات خود اجتہاد کا عنصر داخل ہے کیونکہ مقلِّد اپنی ذہنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق مقلَّد یعنی جس کی تقلید کرتا ہے کو پرکھتا ہے اور اس کو دیانۃً صواب یعنی حق پر پانے کے بعد ہی اس کے قول یا فعل پر عمل کرتا ہے۔اس اعتبار سے لفظ تقلید کوئی ممنوع اور معیوب چیز نہیں۔کیونکہ اس معنی کی روشنی میں کہا جاتا ہے کہ ہماری پوری شریعت کی عمارت تقلید پر ہے۔اس قسم کی تقلید حضورﷺ کے زمانے سے شروع ہوئی اور آج تک امت میں کسی نہ کسی صورت میں رائج ہے۔کیونکہ بقول مولانا عبدالماجد دریابادیؒ صاحب ''تمام صحابہؓ علم ونظر، واقفیت ومعلومات میں ایک دوسرے کے مساوی نہ تھے۔ممتاز ترین صحابہؓ کے درمیان بھی اس حیثیت سے فرق مراتب تھا۔صحاح میں متعدد روایات اس مضمون کی ملتی ہیں کہ فلاں صحابی کو فلاں مسئلے کے متعلق کوئی حکم معلوم نہ تھا۔انہوں نے اپنے سے عالم تر

صحابی سے دریافت کیا اور جواب پانے پر محض ان کے قول پر عمل شروع کر دیا۔بغیر اس تحقیق وتفتیش کے کہ اس جواب کا مبنیٰ وماخذ کیا ہے اور عہد تابعین میں اس کی مثالیں اور بھی کثرت سے ملتی ہیں، کہ تابعی نے محض کسی صحابی کے قول کو سند قرار دے دیا ہے۔۔ظاہر ہے صحابی کا قول بجائے خود حجت نہیں ہوسکتا ،نہ دوسرے صحابی کے لئے ،نہ تابعی کے لئے اور جب کبھی بھی تسلیم کیا جائے تو اس حسن ظن اور اسی اعتماد کی بنیاد پر کہ اس قول کا پیش کرنے والا ،صاحب دیانت اور کتاب وسنت کا علم رکھنے والا ہے۔ اس اعتماد اور حسن ظن کے بغیر دنیا کے علوم وفنون کے کسی شعبہ میں بھی چارہ نہیں۔اس سے کسی طبقۂ انسان کو مفر نہیں''۔اصطلاح میں اسی فطری اور ناگزیر صورت یعنی بلا مطالبہ دلیل، اعتماد اور حسن ظن کی بنیاد پر کسی عالم متدین کے قول کو مان لینے کا نام ''تقلید'' ہے۔اس حسن ظن اور اعتماد کے ساتھ جب اختلاف یعنی بعد میں آنے والے اپنے اسلاف یعنی اپنے سے پہلے بزرگوں کے قول کو بحیثیت وارث کے قبول کرتے ہیں عربی میں اس کی تعریف یوں بنتی ہے **العادات المتوارثہ التی یقلد الخلف السلف** یعنی وہ موروثی عادات جن میں تقلید کرتے ہیں خلف اپنے سلف کی۔لفظِ تقلید''التقالید'' کا مفرد ہے۔انگریزی میں اس لفظ کا معنیٰ یوں بنتا ہے:

> ***Uncritical faith in a sources athoritativeness or in adoption of the legal decisions of Islamic law .***

اسی حسن ظن اور کامل اعتماد کی بنیاد پر ہم قرآن، ذخائر احادیث، آثار صحابہؓ اور قیاس مجتہدین کے وارث ٹھہرے۔اگر اس قسم کا اعتماد صحابہ نے حضورﷺ پر نہ کیا ہوتا یعنی حضورﷺ کے ہر قول وفعل کو محض حضورﷺ کے اعتماد پر حق نہ مانا ہوتا تو حضورﷺ کے اقوال افعال بتواتر ہم تک نہ پہنچے ہوتے قرآن اللہ کی کتاب ہے ابوجہل اور کفار قریش نے اعتماد نہیں کیا انہوں نے انکار کیا لہٰذا کافر ٹھہرے ۔صحابہ حضورﷺ کی صداقت، دیانت اور امانت سے واقف تھے لہٰذا انہوں نے ان کی ذات پر اعتماد کیا اور قرآن کو کلام الٰہی یقین کر لیا لہٰذا وہ فرمانبرداروں کی فہرست میں داخل ہوگئے، حضرت عمرؓ کے زمانے میں جمع قرآن کا سلسلہ شروع ہوا مختلف صحابہ کے پاس مختلف آیتیں محفوظ تھیں جمع کرنے والے اصحاب نے حفاظ کی دیانت پر اعتماد کیا اور ان سے ان کی حفظ میں محفوظ آیتوں کو حاصل کر کے مرتب کیا۔اس

طرح ہم موجودہ قرآن کے وارث بنے۔صحابہ نے حضورﷺ کے خصائل وشمائل کو اپنی زندگیوں میں داخل کیا۔تابعین نے ان کی تقلید یعنی (Imitation) یہ سمجھ کر کی کہ یہ مقدس نفوس اور ہستیاں ہرگز حضورﷺ کے قول وفعل کی خلاف ورزی اپنی نجی اور عمومی زندگیوں میں کرنے والے نہیں ہیں اس طرح جو عاداتِ حضورﷺ بواسطہ صحابہ کرامؓ منقول ہیں ان پر عمل کرنا امت پر واجب ہے۔یہی وجہ ہے کہ حضرات محدثین کرامؒ نے شمائل اور خصائل پر درجنوں کتابیں لکھیں۔مثلاً امام ترمذیؒ نے حضورﷺ کے خصائل وشمائل پر شمائل ترمذی کے نام سے ایک کتاب لکھی جو حدیث کے ذخیرے میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔

خیر اس بحث کا ماحصل یہ نکلا کہ تقلید کا وسیع تر مفہوم اخلاف کا اپنے متدین اسلاف کی دیانت ،ذہانت،امانت اور تفقہ پر مکمل یقین واعتماد کر کے ان کے ہر قول وعمل کو یہ سمجھ کر لینا کہ یہ ان کی تفہیم و توضیح اور تسہیل وتعمیل اقرب الی الاصل یعنی اصل کے بہت قریب ہے بہ نسبت میری ذاتی تفہیم وتوضیح و تسہیل وتعمیل کے۔اسی وسیع تر مفہوم میں علامہ مشرق حضرت سر محمد اقبالؒ تقلید کو لیتے تھے۔علامہ کے نزدیک اس طرح کی تقلید امت کے لئے از حد ضروری ہے اور اس تقلید کی بدولت امت مختلف قسم کے داخلی اور خارجی فتنوں سے محفوظ رہے گی امت بانت بانت کی بولیوں سے بچے گی اور بقول علامہؒ ''یک آئین'' بنے گی یعنی تمام مومنوں کے قول وعمل میں کوئی فرق نہیں دکھائی دے گا اور باطل اس یک رنگی کو دیکھ کر مرعوب ہو جائے گا۔علامہؒ فرماتے ہیں ۔

راہ آبا رو کہ ایں جمعیت است☆ معنی تقلید ضبطِ ملت است

ترجمہ) اپنے بزگوں کی راہ پر چل کیونکہ جمعیت اسی صورت سے حاصل ہوگی۔تقلید کا مطلب ہے ملت کے اندر ربط وضبط قائم کرنا۔

اسی طرح ایک دوسری جگہ علامہؒ فرماتے ہیں ۔

نقش بر دل معنی توحید کن☆ چارہ کار خود از تقلید کن
اجتہاد اندر زمانِ انحطاط☆ قوم را برہم ہمی پیچد بساط
ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر☆ اقتداء بر رفتگاں محفوظ تر
از یک آئینی مسلمان زندہ است☆ پیکر ملت ز قرآن زندہ است

ماہمہ خاک ودل آگاہ نیست☆ اعتصامش کن ز حبل اللہ اوست

ترجمہ) توحید کا مطلب اپنے دل دل پر نقش کر لے اور تقلید سے اپنے طرزِ عمل کو درست کر لے۔انحطاط کے زمانے میں اجتہاد کرنا گویا بساط کو لپیٹ دینا ہے۔عالمان کم نظر (یعنی بصیرت سے تہی دست) کے اجتہاد سے اسلاف کی پیروی کرنا بہتر ہے۔کیونکہ مسلمان یک آئینی سے زندہ ہے۔ہم سب خاک ہیں اور دل آگاہ نہیں ہیں۔اس قرآن کو مضبوطی سے تھام لے کیونکہ وہ اللہ کی رسی ہے۔

مذکورہ بالا اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت علامہ مشرقؒ کا بھی تقلید سے متعلق وہی نظریہ تھا جو برصغیر کے کبار علماء کا تھا۔علامہ ان ہی کا مسلک اپناتے ہوئے اس دور انحطاط میں اجتہاد کی اجازت نہیں دیتے ہیں۔کیونکہ ''رای المریض مریض''یعنی مریض کی رائے بھی مریض ہوتی ہے۔لہٰذا جب زمانے کی حالت یہ ہے کہ لوگوں کی ہمتیں پست ہو چکی ہیں،قلوب نفسانی خواہشوں سے پر ہو چکے ہیں اور لوگوں کے قلوب پر نفسانی خواہشات حکمرانی کر رہے ہیں تلفیقِ کو اجتہاد کے نام سے موسوم کیا جا رہا ہے۔مجتہدانہ صلاحیتوں کے بغیر مجتہدانہ کردار انجام دینے کی کوشش کی جارہی ہیں۔محل ومقام اجتہاد کا کوئی لحاظ نہیں کیا جا رہا ہے۔ان حالات میں اجتہاد سے صرف علامہ ہی نہیں روکتے ہیں بلکہ برصغیر کے فقید المثال عالم دین حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ جس کو برصغیر کے تمام مکاتب فکر مانتے ہیں بھی روکتے ہیں: **''ان ھذہ المذاھب الا ربعة المدونة المحررة قد اجتمعت الامة او من یعتد به منها علی جواز تقلید ھا الی یومنا ھذا وفی ذالک من المصالح ملا یخفیٰ لا سیما فی ھذہ الایام التی قصرت فیھا الھمم جدا و اشربت النفوس الھوی و اعجب کل ذی رائی برایه'' (حجة اللہ لبالغه)**

(ترجمہ) ان میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ مذاہب اربعہ جو مدون ہو چکے اور تحریر میں آچکے ہیں تمام امت یا وہ لوگ جو اس میں قابل اعتبار ہیں اس زمانہ میں ان کی تقلید کے جائز ہونے پر متفق ہیں اور اس تقلید میں بہت سی مصلحتیں ہیں جو مخفی (پوشیدہ) نہیں ہیں خاص کر اس زمانہ میں جس میں لوگ نہایت ہی پست ہمت ہو گئے ہیں اور ان کے قلوب خواہش نفسانی سے پر ہو گئے اور ہر شخص اپنی رائے پر ناز کرنے لگا۔

یہی وجہ ہے کہ علامہ کے نزدیک اجتہاد کے لئے انفرادی اور اجتماعی اعتبار سے امت کا غیر معمولی صلاحیتوں سے مالا مال ہونا ضروری ہے۔ علامہ کے نزدیک جو صلاحیتیں اجتہاد کے لئے درکار ہیں وہ روبہ زوال ہیں امت ان صلاحیتوں سے انفرادی اور اجتماعی اعتبار سے محروم ہو چکی ہے۔ علامہ نے اس کا اظہار اس شعر میں کیا ہے ؎

اجتہاد اندر زمانِ انحطاط ☆ قوم را برہم ہمی پیچد بساط

زمانہ انحطاط سے مراد علامہؒ کا اپنا زمانہ ہے۔ کیونکہ علامہ کے زمانہ میں ''عصر جدید کے مسائل اور اسلامی ارتقاء کے عالم نو کی تحقیق کا مسئلہ'' بڑے زور وشور سے اُٹھا تھا۔ لیکن امت اسلامیہ من حیث الکل عرب تا عجم سیاسی، سماجی اور علمی اعتبار سے پستی کی شکار ہو چکی تھی تب سے آج تک اس مرض میں روز بہ روز اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس کا علم ہمیں علامہ کی ان سطور سے ہوتا ہے جس کا نقشہ وہ ایک خط بنام اکبر الہ آبادی میں اس طرح کھینچتے ہیں:

''یہاں لاہور میں ضروریات اسلامی سے ایک متنفس بھی آگاہ نہیں۔ یہاں انجمن اور کالج اور فکر مناصب کے سوا اور کچھ نہیں۔ پنجاب میں علماء کا پیدا ہونا بند ہو گیا۔ صوفیاء کی دکانیں ہیں مگر وہاں سیرت اسلامی کی متاع نہیں بکتی''۔ (شیخ عطاء اللہ۔ اقبال نامہ حصہ دوم لاہور شیخ محمد اشرف، ۱۹۵۱ء صفحہ نمبر ۴۸)۔

ان حالات میں جو تحریکیں اور لوگ بشمول علامہؒ اُٹھے ان کے نزدیک اجتہادی موشگافیوں سے بڑھ کر اسلامیت کی رہی سہی شکل کو بچانا سب سے اونچا کام تھا۔ کیونکہ اسی عمارت کی تزئین کی جاتی ہے جس کی بنیاد اور ڈھانچہ مضبوط وموجود ہو جس عمارت کی بنیادیں اور ڈھانچہ ہی خدانہ خواستہ کسی وجہ سے خستہ ہو چکی ہوں اس کی تزئین پر بنیادیں اور ڈھانچہ ٹھیک کرنے سے پہلے زر کثیر خرچ کرنا عقلی اعتبار سے غیر دانشمندانہ عمل ہے۔ خیر اس انتشاری دور میں علوم اسلامیہ کی طرف امت کا رجحان کم ہوا۔ اسلامی اداروں کی حالت خستہ ہوئی تمام مدارس اسلامیہ حکومتی سرپرستی سے محروم ہوئے اور امت کا درد رکھنے والے علماء کو ان مدارس کے اخراجات صدقات وزکوٰۃ سے پورے کرنے پڑے تھے۔ امراء اور آسودہ قسم کے لوگوں نے اپنے بچوں کو ان اداروں میں داخل کیا جہاں صرف دنیاوی علوم ہی رائج ہوتے تھے اس طرح وہ بچے دینی سرپرستی سے محروم ہو گئے اور ان کے اندر کوئی دینی صلاحیت نہ رہی۔ مدارس اسلامیہ میں صرف اور صرف غرباء اور پسماندہ قسم کے لوگ اپنے بچے ڈالتے تھے۔ یہاں سے ان مدارس میں

جدید علوم کا کوئی انتظام امراء کی عدم دلچسپی اور مسلم حکومتوں کی غیر التفاتی کی وجہ سے نہیں رہا لہٰذا وہ جدید مسائل کو سمجھنے سے یکسر قاصر رہے۔ اس طرح جدید وقدیم علوم کے حامل لوگوں میں کوئی ربط نہیں رہا دوری دن بہ دن بڑھتی چلی گئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ ہی دانشوروں کی دانشمندی سے علماء استفادہ کر سکے اور نہ ہی علماء کے علوم سے دانشور مستفید ہو سکے۔ اسی طرح امت من حیث الکل فرزندانِ ملت کی تقسیم شدہ دو صلاحیتوں سے کوئی منفعت حاصل نہیں کر سکی۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ کا رِاجتہاد یا بالفاظ دیگر علامہؒ ''فقہ اسلامی کی جدید تدوین'' کے لئے دونوں صلاحیتوں کو جمع کرنے کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ وہ بخوبی سمجھتے تھے کہ کار اجتہاد یا فقہ کی جدید تدوین کے لئے عصر حاضر میں ایک ہی صلاحیت کافی نہیں ہے۔ اس چیز کا اندازہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدیر برہان دہلی کی اس عبارت سے ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''دار العلوم دیوبند میں اختلافات کے باعث جب حضرت الاستاذ (یعنی انور شاہ صاحب کشمیریؒ) نے اپنے عہدہ صدالاستاتذہ سے استعفیٰ دیا اور یہ خبر اخبارات میں چھپی تو اس کے چند روز بعد میں ایک دن ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ فرمانے لگے آپ یا دوسرے مسلمانوں کا جو بھی تاثر ہو میں بہر حال شاہ صاحب کی استعفےٰ کے خبر پڑھ کر بہت خوش ہوا ہوں۔ میں نے بڑے تعجب سے عرض کیا۔ ''کیا آپ کو دار العلوم دیوبند کے نقصان کا کچھ ملال نہیں ہے؟'' فرمایا کیوں نہیں؟ مگر دار العلوم دیوبند کو صدر المدرس اور بھی مل جائیں گے اور یہ جگہ خالی نہ رہے گی۔ لیکن اسلام کے لئے اب جو کام میں شاہ صاحب سے لینا چاہتا ہوں اس کو سوائے شاہ صاحب کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکتا۔

اس کے بعد انہوں نے اس اجمال کی تفصیل یہ بیان کی کہ آج اسلام کی سب سے بڑی ضرورت فقہ کی جدید تدوین ہے جس میں زندگی کے ان سینکڑوں ہزاروں مسائل کا صحیح حل پیش کیا گیا ہو جن کو دنیا کے موجودہ اور بین الاقوامی، سیاسی، معاشی اور سماجی احوال وظروف نے پیدا کر دیا ہے۔ مجھ کو پورا یقین ہے کہ اس کام کو میں اور شاہ صاحب دونوں مل کر کر سکتے ہیں۔ ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی شخص اس وقت عالم اسلام میں نظر نہیں آتا جو اس عظیم الشان ذمہ داری کا حامل ہو سکے۔ پھر فرمایا یہ مسائل کیا ہیں؟ اور ان کا سرچشمہ کہاں ہے؟ میں ایک عرصہ سے ان کا بڑے غور سے مطالعہ کر رہا ہوں۔ یہ سب مسائل میں شاہ صاحب کے سامنے پیش کروں گا اور ان کا صحیح اسلامی حل کیا ہے؟ شاہ صاحب بتائیں گے۔ اس طرح ہم دونوں کے اشتراک سے فقہ جدید کی تدوین عمل میں آجائے گی''۔ چنانچہ با

خبر اصحاب کو معلوم ہے اس جذبہ کے ماتحت ڈاکٹر صاحب مرحوم نے بڑی کوشش کی کہ کس طرح شاہ صاحب دیوبند کی خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد لاہور تشریف لے آئیں اور وہیں مقیم ہو جائیں ۔لیکن افسوس! حالات کچھ اس قسم کے تھے کہ ایسا نہ ہو سکا اور حضرت شاہ صاحب لاہور کے بجائے ڈابھیل تشریف لے گئے ۔جس کا ڈاکٹر صاحب کو واقعی ملال اور صدمہ ہوا''۔ (بحوالہ حیات انور حصہ اول ابن الانور مولانا سید محمد از ہر شاہ قیصر صفحہ نمبر ۱۹۲ تا ۱۹۳ واقبال کے ممدوح علماء صفحہ ۱۳۸ از قاضی افضل حق قریشی)

مذکورہ بالا عبارت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ علامہؒ نے اپنے مجدد یا فقیہ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا انہوں نے یہ نہیں کہا کہ میں خود اجتہاد کر کے مسائل کا حل ڈھونڈ نکالوں گا ۔ بلکہ یہ کہا کہ میں نے عصر حاضر کی شبِ تاریک خوب دیکھی اور اس سے جو مسائل ابھر کر سامنے آئے ہیں ان کا مجھے بخوبی علم ہوا ہے لہٰذا میں ان مسائل کا تفصیلی استفتاء تیار کر کے (شاہ صاحب جو کہ فقیہ ہے کیونکہ اس کو علوم اسلامیہ کے تمام منابع (sources) پر نظر ہے) کے سامنے ڈالوں گا وہ ان علوم کی روشنی میں ان کا شرعی حل بیان کریں گے ۔ وہ اپنے آپ کو بحیثیت مستفتی پیش کرتا ہے نہ کہ بحیثیت مفتی اور یہی اس کے بڑے پن کی دلیل ہے ۔ وہ منظوم انداز میں اس کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں ؎

میں نہ عارف، نہ مجدد، نہ محدث، نہ فقیہ ☆ مجھ کو معلوم نہیں کیا ہے نبوت کا مقام
ہاں مگر عالم اسلام پہ رکھتا ہوں نظر ☆ فاش ہے مجھ پہ ضمیر فلک نیلی فام
عصر حاضر کی شب تاریک دیکھی میں نے ☆ یہ حقیقت ہے کہ روشن صفت ماہ تمام (ضرب کلیم)

اگر ہم مولانا انور شاہ صاحب کو قدیم صلاحیت مانتے ہیں تو علامہ کو جدید صلاحیت سے تعبیر کرنا پڑے گا ۔ کیونکہ علامہؒ علوم جدید کے تمام منابع سے واقف ہی نہیں بلکہ ان علوم کے تمام طلسمات علامہؒ پر فاش ہو چکے تھے اور وہ اس کے بتوں کو اس طرح توڑنے میں محو ہوئے کہ اُن کی تنقید اس طلسماتی تہذیب کے حق میں ضرب کلیم ثابت ہوئی ۔ علامہؒ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

طلسم علم حاضر را شکستم ☆ ربودم دانہ و دامش گستم
خدا داند کہ مانند براہیمؑ ☆ بہ ناراو چہ بے پروا نشستم

(ترجمہ) میں نے عصر حاضر کے طلسمات کو توڑا ۔ میں نے اس کا دانہ اُچک لیا اور اس کے پھنسانے والے جال کو توڑ دیا ۔ اے اللہ ابراھیمؑ کی طرح میں کس طرح اس میں بے پروا بن کر بیٹھا ہوں ۔

اس طرح مولانا انور شاہ صاحبؒ کا انتخاب اس کار اجتہاد کے لئے علامہ نے یونہی نہیں کیا تھا بلکہ یہ جان کر کہ وہ علوم عقلیہ ونقلیہ کے بحر ذخار ہیں ۔ یہ بات علامہؒ ہی نہیں بلکہ انور شاہ صاحبؒ کے ہم عصر چوٹی کے علماء بھی تسلیم کرتے تھے مثلاً مشہور مفسر قرآن شبیر احمد عثمانیؒ نے انور صاحبؒ کے وفات پر ان الفاظ میں ان کا خراج تحسین ادا کیا ''میں محسوس کر رہا ہوں کہ حافظ ابن حجرؒ، شیخ تقی الدینؒ اور سلطان العلماء کا انتقال آج ہو رہا ہے''۔ اسی طرح سید سلیمان ندویؒ نے ان کو ان الفاظ میں یاد کیا ''دین و دانش کا مہر انور ۳ صفر ۱۳۵۲ ھجری مطابق ۲۹ مئی ۱۹۳۳ء کی صبح کو دیوبند کی خاک میں ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا یعنی مولانا سید انور شاہ صاحبؒ.....اس کے بعد ان کے علوم پر دسترس کا خاکہ اس طرح کھینچتے ہیں کہ:

''مرحوم کم سخن لیکن وسیع النظر تھے ۔اُن کی مثال سمندر کی سی تھی ۔ جس کی اوپر کی سطح ساکن لیکن اندر کی سطح موتیوں کے گراں قیمت خزانوں سے معمور ہوتی ہے ۔ وہ وسعت نظر، قوت حافظہ اور کثرت حفظ میں اس عہد میں بے مثال تھے ۔ علوم حدیث کے حافظ و نکتہ شناس، علوم ادب میں بلند پایہ، معقولات میں ماہر، شعر و سخن سے بہرہ مند اور زہد و تقویٰ میں کامل تھے''۔ (سلیمان ندوی شذرات'' معارف ۳۲: ۱ جولائی ۱۹۳۴ء، ص ۲، بحوالہ اقبالؒ کے ممدوح علماء)

ان کی علمی وجاہت کا اعتراف اُن کی وفات پر اقبالؒ اس طرح کرتے ہیں:

''اسلام کی ادھر کی پانچ سو سالہ تاریخ شاہ صاحب کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے''۔ (عبدالرشید ارشد بیس بڑے علماء لاہور: مکتبہ رشیدیہ ۱۹۷۱ء صفحہ ۳۷۵)

علامہؒ نے کارِ اجتہاد کے لئے اس لئے انور شاہ صاحب کا انتخاب کیا تھا ۔ کیونکہ وہ اپنی غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے علوم عقلیہ ونقلیہ پر زبردست عبور رکھتے تھے ۔ وہ اس عقیدے کے قائل نہیں تھے کہ ہر ایرا غیرا نتھو خیرا اس کام کا متحمل ہو سکتا ہے ۔ اجتہاد تو بڑی بات علامہؒ سادہ ترجمہ قرآن کے لئے بھی عربی زبان و ادب پر دسترس ہونے کو لازمی سمجھتے ہیں ۔ جو لوگ عربی زبان وادب سے ناواقف اور قدیم عرب کے علمی سرمایہ سے آشنا ہونے کے بغیر قرآن کی تفسیر کرتے تھے علامہؒ کو ان کی اس کوشش سے بہت تکلیف ہوتی تھی ۔ اس کا اظہار فقیر وحیدالدین اس طرح کرتے ہیں:

''بعض ایسے لوگ بھی مسلمانوں میں پائے جاتے ہیں، جو نہ عربی زبان وادب میں خاطر خواہ استعداد رکھتے ہیں نہ عربی کے قدیم علمی سرمایہ پر ان کی نگاہ ہے، نہ قرآن کریم کو ٹھیک طور پر سمجھ سکتے ہیں، مگر اپنی علمی تہی مائیگی کے باوجود قرآن کریم کے ترجمہ اور تفسیر کی کوشش فرماتے ہیں ۔ ڈاکٹر صاحب کو اس قسم کی باتوں

سے بڑی اذیت ہوتی تھی۔ وہ اپنی متانت، سنجیدگی اور عالی ظرفی کے باوجود اس غم کو چھپا نہ سکے۔ ایک بار فرمایا ہی دیا کہ قرآن کریم اس اعتبار سے بڑا ہی مظلوم صحیفہ ہے کہ جسے دنیا میں اور کوئی کام نہیں ملتا وہ اس کے ترجمہ و تفسیر میں مصروف ہو جاتا ہے۔ حالانکہ یہ نہایت ہی نازک اور محتاط ذمہ داری ہے" (بحوالہ اقبال ایک تجزیہ تصنیف و ترتیب ڈاکٹر بشیر احمد نحوی اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی صفحہ ۲۲)۔

خیر علامہؒ کے نزدیک انحطاط کے زمانے میں ایمان، اعمال اور اپنا اسلام بچانے کا واحد علاج تقلید اسلاف ہے۔ جب محکوم قوم احساس کمتری کا شکار ہو جاتی ہے تو وہ (محکوم قوم) **الناس علیٰ دین ملوکھم** کے تحت اپنے آقاؤں کی کورانہ تقلید فکر و نظر میں کرنے لگتی ہے۔ اس طرح صحیح تحقیق و تجسس کا مایہ قوم میں ختم ہو جاتا ہے۔ پھر وہ ذہنی اعتبار سے بانجھ ہو جاتی ہے کہ اپنے مفاد اور غرض کی خاطر بجائے خود بدلنے کے قرآن کے معنی و مفہوم کو بدلنے کی کوشش کرتی ہے۔

ہندوستان میں انگریز کے تسلط سے ہی تحقیقات اسلامی کا زوال شروع ہوا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ تک ہندستان میں اجتہادی شان موجود تھی لیکن شاہ صاحب کے بعد جب انگریز نے قدم جمائے تو تحقیق و تجدید کی صلاحیت بھی کم ہوتی چلی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ بعد میں کچھ روشن خیال لوگ اس طرح قرآن میں اجتہاد کرنے لگے کہ معجزات اور اجتہاد کا تدریجاً انکار ہونے لگا۔ اس قسم کے حالات نے علامہؒ کو خاموش رہنے نہیں دیا۔ وہ بول اُٹھے ؎

ہند میں حکمت دین کوئی کہاں سے سیکھے
نہ کہیں لذت کردار نہ افکارِ عمیق
حلقہ شوق میں وہ جرأتِ اندیشہ کہاں
آہ محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق
خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

اس تناظر میں پروفیسر سید احمد صدیقی صاحب لکھتے ہیں:

"کہ انحطاط کے زمانے میں قوائے جسمانی و ذہنی دونوں پژمردہ ہو جاتے ہیں اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسلاف کے کارنامے اپنی نظروں میں ناقابل رسائی معلوم ہونے لگتے ہیں۔ انسانی فطرت دشواری و اولوالعزمی سے کنارہ کش رہنا چاہتی ہے۔ قوم اور افراد دونوں فاتح کی حیثیت حاصل کرنے کے بجائے فاتحین کی ہم رکابی و ہم نوائی زیادہ پسند کرنے لگتے ہیں۔ اقبالؒ نے اس حالت میں تقلید کو اجتہاد سے بہتر بتایا ہے۔" (آثار اقبالؒ بحوالہ عرفان اقبالؒ در حاشیہ ص نمبر ۲۸۸ تا ۲۸۹)

گذشتہ سطور سے ہرگز یہ مطلب نہیں نکالا جانا چاہئے کہ علامہ اقبالؒ اجتہاد کا دروازہ بند کرنا چاہتے ہیں۔ نہیں! بلکہ علامہؒ امت میں اجتہادی قوت کے زوال پر ماتم کر رہے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے زمانے میں جن مصلحین نے اجتہاد کی پرزور حمایت کی اور اجتہاد کے فضائل بھی بیان کئے۔ علامہ ان مصلحین کو ایک طرف مبارک باد دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس طرح کی کوشش اگر اخلاص اور امت کو پستی سے نکالنے کے لئے شرعی حدود کے اندر کی جائے تو یقیناً اس سے ایک عظیم انقلاب برپا ہو سکتا ہے کیونکہ اس عالم ایجاد میں اصحاب ایجاد ہی بحیثیت فاتح زندگی گزار سکتے ہیں اور باقی اقوام کو ان کے ارگرد چار و ناچار طواف کرنا ہی ہے۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ مشرق میں جو تجدید و اجتہاد کا غلغلہ اور دھوم ہے یہ صرف تقلید افرنگ کے لئے راستہ ہموار کرنے کا بہانہ ہے جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہمارے نام نہاد مجتہدین دین و شریعت میں ایسی رکیک تاویلیں کریں گے جن کی بدولت مغربی تہذیب و ثقافت کو اپنانے کے لئے راستہ ہموار ہو جائے گا۔ جس کا مشاہدہ آج ہم کھلی آنکھوں سے کر رہے ہیں۔ یہی اندیشہ علامہ اقبالؒ ان الفاظ میں کرتے ہیں ؎

جو عالم ایجاد میں ہے صاحب ایجاد ☆ ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ
تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو ☆ کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ
اس قوم کی تجدید کا پیغام مبارک ☆ ہے جس کے تصور میں فقط بزم شبانہ
لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید ☆ مشرق میں ہے تقلید فرنگی کا بہانہ

(ضرب کلیم)

یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک اپنے اسلاف کے تفقہ اور تدین پر کامل بھروسہ کر کے ان کی شاندار صورت و سیرت کی تقلید مندوب ہے۔ اس تقلید میں امت کی کامیابی کا راز پوشیدہ ہے۔ اس کے

برعکس علامہؒ تقلید فرنگ پر مسلمانوں سے نالاں ہیں۔ وہ مسلمانون کو یورپ کی تقلید کرنے سے عار دلاتے ہیں۔ علامہ کے نزدیک مسلمانوں کے بصیرت سے محروم ہونے کی بنیادی وجہ مغرب کی اندھی تقلید ہے۔ اور اس تقلید کی وجہ سے مسلمان اب کھلی حقیقتوں کو بھی نہیں سمجھ سکتے ہیں۔ وہ اقوام مشرق کو اُن کی کورانہ تقلید سے اپنے آپ کو بچانے کی صلح دیتے ہیں ؎

نظر آتے نہیں بے پردہ حقائق ان کو☆ آنکھ جن کی ہوئی محکومی وتقلید سے کور
ندہ کرسکتی ہے ایران وعرب کو کیونکر☆ یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لب گور (ضرب کلیم)

علامہ اقبالؒ ان مصلحین سے اس لئے مایوس ہیں کیونکہ یہ لوگ پرانے اور قدیم اسلامی علوم و روایات سے خالی ہیں۔ علامہ اقبالؒ اس نا امیدی کا اظہار ''مصلحین مشرق'' کے عنوان کے تحت ضرب کلیم میں اس طرح کرتے ہیں ؎

میں ہوں نا امید تیرے ساقیان سامری فن سے
کہ بزم خاوراں میں لے کے آئے سانگیں خالی
نئی بجلی کہاں ان بادلوں کے جیب و دامن میں
پرانی بجلیوں سے بھی ہے جن کی آستین خالی

علامہؒ ان اشعار میں فرماتے ہیں کہ اے اہل مشرق جو تمہاری اصلاح کرنے والے ساقی یار ہبر ہیں ان کے پاس جو صراحیاں اور پیالے ہیں وہ اصلاحی شراب سے خالی ہیں میں ان اصلاح کرنے والے ساقیوں سے نا امید ہوں۔ کیونکہ جن مصلحین کے بادلوں کے دامن اور گریباں پرانی بجلیوں سے خالی ہیں۔ ان میں نئی بجلیاں کہاں سے آئیں گی مراد یہ کہ جو لوگ اپنی قدیم اسلامی روایات، اقدار، علوم وفنون سے واقف نہیں وہ نئے دور کے علوم وفنون اور اقدار و روایات سے تمہیں کیا فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ وہ ان سے نقصان تو پہنچا سکتے ہیں فائدہ نہیں۔ علامہؒ مغرب کی تقلید سے اس لئے روکتے ہیں کیونکہ یہ تہذیب نظر و قلب دونوں کے لئے فتنہ ہے۔ اسکی ثقافت اور تمدن کی روح میں حیا اور پاکدامنی نہیں ہے۔ ظاہری اعتبار سے اگرچہ یہ خوب روشن ہوتی ہے لیکن اس کا باطن ناپاک وپلید ہے۔ باطن ہی خراب ہو تو آدمی ضمیر پاک، خیال بلند اور ذوق لطیف کی اعلیٰ اقدار وصفات سے محروم ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں ؎

فساد قلب ونظر ہے فرنگ کی تہذیب☆ کہ روح اس مدنیت کی رہ نہ سکی عفیف

رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید☆ ضمیر پاک وخیال بلند وذوق لطیف (ضرب کلیم)

حضرت علامہؒ بحیثیت مقلد

حضرت علامہ اقبالؒ بڑے پایہ کے محقق تھے۔ اُن کے محقق ہونے کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتی ہے کہ ان کے ہم عصر عالم بے بدل حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ (جن کے متعلق علامہ علی مصری حنبلیؒ نے قیام دارالعلوم دیوبند کے دوران حضرت کے درسوں کو بغور سننے کے بعد جوش میں آکر کہا تھا کہ ''**لو حلفت انه اعلم من ابی حنیفه لما حَنِثْتُ**'' کہ اگر میں قسم کھا کر یہ کہوں کہ یہ شخص ابو حنیفہؒ سے اعلم (زیادہ جاننے والا) ہے تو میں اپنی قسم میں حانث (جھوٹا) نہیں ہوں''۔ انہوں نے یہ کہا کہ جتنا استفادہ مجھ سے ڈاکٹر صاحب نے کیا ہے کسی مولوی نے نہیں کیا'' (بحوالہ ملفوظاتِ محدث کشمیری از مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری صفحہ ۳۰۱)۔ اسی طرح اپنی کتاب ضرب الخاتم کے بارے میں جو کہ اقبالؒ نے شاہ صاحبؒ سے حاصل کی تھی کے متعلق فرمایا کہ ''میرے نزدیک جو کچھ ضرب الخاتم کو اقبالؒ سمجھے ہیں اس کو کوئی مولوی نہیں سمجھ سکا'' (بحوالہ مذکورہ بالا کتاب صفحہ نمبر ۳۲۷) خیر یہ تو اقبالؒ کے دینی علوم میں دسترس کا ثبوت ہے جس کا اب کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ ان کی دنیاوی علوم میں کتنی گہری نظر تھی۔ اس کا اندازہ ہمیں پروفیسر آرنلڈ (جن سے اقبال نے علم فلسفہ میں رہبری حاصل کی تھی) کے اس جملہ سے ہوسکتا ہے کہ ''ایسا شاگرد استاد کو محقق بناتا ہے اور محقق کو محقق تر'' بحوالہ تاریخ ساز جوانیاں ص ۱۳۹ از محمد جاوید خالد)۔ اس علمی تبحر کے باوجود علامہؒ اپنے کو مقلد ہی کہتا ہے وہ تقلید کے دائرے سے اس لئے باہر نہیں نکلنا چاہتے ہیں کیونکہ ان کو اسی میں عافیت نظر آرہی ہے۔ انکے اس عقیدے اور موقف کا علم ہمیں علامہؒ کے وصیت نامہ بنام جاوید اقبال کی اس عبارت سے ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''باقی دینی معاملے میں صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ میں اپنے عقائد میں بعض جزوی مسائل کے سوا جو ارکان دین میں سے نہیں سلف الصالحین کا پیرو ہوں اور یہی راہ بعد کامل تحقیق کے محفوظ معلوم ہوتی ہے۔ جاوید کو میرا یہی مشورہ ہے کہ وہ اسی راہ پر گامزن رہے۔ اور اس بدقسمت ملک ہندستان میں علماء نے جو دینی عقائد کے نئے فرقے مختص کر دئے ہیں ان سے احتراز کرے۔ بعض فرقوں کی طرف سے لوگ محض اس واسطے قائل ہو جاتے ہیں کہ ان فرقوں کے ساتھ تعلق پیدا کرنے سے دنیوی فائدہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ بڑا بدبخت ہے وہ انسان جو صحیح دینی عقائد کو مادی منافع کی خاطر قربان کر

دے۔غرض یہ ہے کہ طریقہ حضرات اہل سنت محفوظ ہے اور اسی پر گامزن رہنا چاہئے۔اور ائمہ اہل بیت کے ساتھ محبت اور عقیدت رکھنی چاہئے''۔محمد اقبال ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۵ء بحوالہ (اردو ڈائجسٹ ہمارے ۱۹۷۷ء ص ۱۲۹ تا ۱۳۰)

اسی طرح اکتوبر ۱۹۳۵ء میں اقبالؒ بیمار ہوئے۔تو انہوں نے ایک وصیت لکھی جس میں مختلف امور کی وصیت کرنے کے بعد ''مکرر آنکہ'' کے تحت اس طرح رقمطراز ہیں:

''دیگر میرے مذہبی عقائد سب کو معلوم ہیں۔میں عقائد میں سلف کا پیرو ہوں۔نظری اعتبار سے فقہی معاملات میں غیر مقلد ہوں علمی اعتبار سے امام ابوحنیفہؒ کا مقلد ہوں'' (نوٹ) نظری اعتبار سے غیر مقلد ہوں کا مطلب یہ ہے کہ اتنا تنگ نظر نہیں ہوں کہ دیگر ائمہ نے جو کچھ لکھا ہے اس کی طرف نہ دیکھوں استفادہ تو کرتا ہوں لیکن مقلد امام ابوحنیفہؒ کا ہوں۔

علامہؒ کو فقہائے اسلام کے تفقہ پر کامل اعتماد تھا۔وہ صرف اس بات کے قائل نہیں تھے کہ علماء صرف دینی حقائق کو ہی سمجھ سکتے ہیں بلکہ ان کے دل میں یہ بات تحقیق کی بنیاد پر رچ بس چکی تھی کہ علماء اور فقہائے اسلام زندگی کے تمام معالات میں غیر معمولی درک (سمجھ) رکھتے ہیں۔علامہؒ نے مدیر زمیندار کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

''جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ حالات حاضرہ محض ایک سیاسی مفہوم رکھتے ہیں اور پختہ کارانِ سیاست ہی اس کے فیصلہ کے اہل ہیں اور مسند نشینانِ پیغمبر کو ان حالات سے سروکار نہیں، وہ میری رائے ناقص میں ایک خطرناک غلطی میں مبتلا ہیں جو حقائق و تاریخ اسلامیہ اور شریعت حقہ کے مقاصد کے نہ سمجھنے سے پیدا ہوتی ہے۔قومی زندگی کی کوئی حالت ایسی نہیں جس پر فقہائے اسلام نے حیرت انگیز چھان بین نہ کی ہو۔(اقبالؒ اور انجمن حمایت اسلام ص ۱۰۲ بحوالہ اقبال کے ممدوح علماء از قاضی افضل حق قریشی)

یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبالؒ سیاسی معاملات میں بھی علماء کرام کے فیصلوں کے منتظر رہتے تھے۔ایک موقعہ پر انھوں نے کہا:

ہم مذہب کو تمام چیزوں سے بالاتر سمجھتے ہیں اور علماء کرام کو اپنا حکم سمجھتے ہیں۔جمعیت علماء ہند جو کچھ فیصلہ کرے گی وہی ہماری رائے ہے۔(اقبالؒ اور انجمن حمایت اسلام ص ۹۸ بحوالہ اقبال کے ممدوح علماء)

یہ بات ثابت ہو چکی کہ علامہ فقہی، علمی اور سیاسی مسائل میں علماء کی دانش پر اپنی رائے رکھنے کے باوجود اعتماد کرتے تھے۔طریقت کی لائن میں بھی علامہ اپنے آپ کو مقلد اور مرید ہی کہلاتے ہیں۔یہ بات

پایہ ثبوت کو پہنچی ہوئی ہے کہ علامہ سلسلہ چشتیہ میں مرید تھے۔اس کے علاوہ ان کو دنیائے اسلام کے ایک مشہور صوفی مولانا رومیؒ کی باطنی رہبری اور توجہ کے علاوہ ان کی مثنوی سے سوز و گداز کی نعمت حاصل ہوئی تھی فرماتے ہیں ؎

پیر رومی را رفیقِ راہ ساز ☆ تا خدا بخشد ترا سوز و گداز

(ترجمہ) پیر رومی کو اپنا رہبر بنا تا کہ خدا تجھے سوز و گداز سے نوازے۔

لیکن پیر رومی کی بات سمجھنے میں انہوں نے علماء کی طرف رجوع کیا۔ایک جگہ خواجہ حسن نظامی کو لکھتے ہیں کہ:

''حضرت! میں نے جلال الدین رومیؒ کی مثنوی کو بیداری میں پڑھا ہے۔آپ نے شاید اسے سکر کی حالت میں پڑھا ہے کہ اس میں آپ کو وحدت الوجود نظر آتا ہے۔مولوی اشرف علی صاحب تھانوی سے پوچھئے وہ اس کی تفسیر کس طرح کرتے ہیں۔میں اس بارے میں ان ہی کا مقلد ہوں (مقالات اقبال ص ۱۸۰)

اقبال اپنے آپ کو سلفی اس لئے کہتے ہیں کونکہ وہ اپنے متدین اسلاف کی پیروی بغیر کسی دلیل کرتا ہے۔بقول مولانا ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی زید مجدھم ''انسان سلف کی بلا دلیل پیروی سے ہی سلفی بن سکتا ہے۔اگر کوئی سلفی بننا چاہے تو اس کا ایک ہی حل ہے کہ اسلاف کی بلا دلیل پیروی کرے، ورنہ وہ سلفی کہاں رہا'' (ماہنامہ الفرقان لکھنؤ اپریل ۲۰۱۲ صفحہ ۳۳)

اس طرح علامہؒ اپنے آپ کو مقلد محض سمجھتے ہیں کیونکہ اُن کے نزدیک تقلید اہل کمال کی پیروی کا نام ہے وہ جانتے تھے کہ ہمارے اسلاف بھی پہلوں کی تقلید سے ہی آگے چلے ہیں۔مزید برآں وہ تقلید کو جمود کے معنیٰ میں نہیں بلکہ ربط ملت کے معنی میں سمجھتے تھے ؎

معنی تقلید ضبط ملت است

ربط ملت اس معنی کر کے جب یہ بات تسلیم کی گئی کہ اجتہاد کی ضرورت ہے تو اس کا دوسرا مطلب یہ ہوا کہ لوگ اجتہادی شان نہیں رکھتے ہیں۔جب سارے لوگ اجتہادی شان نہیں رکھتے ہیں تو غیر مجتہدین کو مجتہدین کی پیروی کرنی ہوگی۔اگر غیر مجتہدین مجتہدین کی پیروی نہیں کریں گے اور خود روی کی راہ اختیار کریں گے تو فساد برپا ہوگا۔ہر ایک اپنی رائے پر عمل کرے گا۔ہر ایک کا مسلک جدا جدا ہوگا۔اس طرح امت بے ربطی کا شکار ہوگی۔یہی وجہ ہے کہ علامہؒ تقلید پر زور دیتے ہیں اور ذات کے اعتبار سے ہمیشہ مقلد رہنا ہی پسند کرتے ہیں۔

شرائط و مدارج اجتہاد

اصطلاح میں تفصیلی اور شرعی دلائل سے احکام شرعیہ کو مستنبط **(Extract)** کرنے میں کسی فقیہہ کے انتہائی جدوجہد کرنے کے عمل کو اجتہاد کہتے ہیں۔ اجتہاد ایک شرعی عمل ہے اور اسے شریعت کے اصل اور بنیادی سرچشمے یعنی قرآن وحدیث کی مدد سے ہی انجام دیا جاتا ہے۔ ''اجتہاد سے نکالے گئے حکم کی نسبت اللہ کی طرف ہوتی ہے یعنی جس طرح قرآن یا حدیث میں اللہ کا واضح حکم موجود ہے اسی طرح جن مسائل میں اجتہاد کے ذریعہ بعد تحقیق حکم معلوم کیا جاتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ ان مسائل میں یہ اللہ کا حکم ہے'' ابہت ہی بڑی ذمہ داری ہے۔ اللہ کی جانب کسی حکم کا انتساب کرتے وقت اگر ذرا سی بھی کوتاہی ہو جائے، یہ اللہ پر بہتان باندھنا ہوا۔ مجتہد کی خطا کے متعلق جو اکابر مقلدین نسفیؒ، تفتازانیؒ وغیرھم کی کتب میں یہ صراحت کی گئی ہے کہ "**المجتھد قد یخطی و یصیب**" کہ مجتہد کے اجتہادات (اصل وفروع میں) غلط بھی ہوتے ہیں اور صحیح بھی۔ میں تفصیل یہ ہے کہ مجتہد بالقصد یعنی جان بوجھ غلطی نہیں کرتا ہے۔ وہ اپنی تمام صلاحیت کو خرچ کرنے کے بعد دیانتاً اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ جو مسئلہ اس نے نکالا ہے وہ اللہ اور رسول ﷺ کے عین منشا کے مطابق ہے لہٰذا نامعلوم حکم کے بارے میں اللہ اور رسول ﷺ کے منشا کو ڈھونڈنے کے دوران مجتہد کی یہ علمی سعی اللہ کو بہت پسند ہے۔ اس سعی میں اگر مجتہد کامیاب ہوا تو اس کو دوگنا ثواب (اجر) ملتا ہے ایک اللہ کے حکم پر عمل کرنے کا اور ایک اللہ کے حکم کو تلاش کرنے کی سعی کا۔ اگر ناکام ہو تو سعی ثواب تو بہرحال اللہ تعالیٰ دیں گے ہی۔ اسی بنیاد پر علماء نے لکھا ہے کہ ''مجتہد کا اجتہاد صحیح ہے تو دوگنا ثواب اور اگر غلط تو ایک گنا ثواب''۔

مذکورہ بالا عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ کار اجتہاد ایک انتہائی مشکل، نازک اور حساس عمل ہے۔ جو عمل جتنا مشکل اور نازک ہوتا ہے اس کے شرائط اتنے مشکل اور نازک ہوتے ہیں۔ اس کام کی حساسیت اور نزاکت کو مدنظر رکھتے ہوئے امت کے تمام اکابر علماء نے مجتہد کے لئے درج ذیل صلاحیتوں کا حامل ہونا ضروری ٹھہرایا ہے:

۱: عربی زبان پر عبور رکھتا ہو۔
۲: قرآن کے معنی اور مفہوم سے خوف واقف ہو۔
۳: احادیث کا علم رکھتا ہو.
۴: قرآن کے ناسخ اور منسوخ کا علم رکھتا ہو۔

۵: اجماع اور اجماعی مسائل کا شناسا ہو۔
۶: قیاس کے آداب وطریقوں سے واقف ہو۔
۷: شرعی نصوص سے احکام حاصل کرنے میں جن امور کا لحاظ رکھا جانا ضروری ہے ان کو جانتا ہو۔
۸: شریعت کے عمومی اور بنیادی مقاصد ومصالح کا واقف کار ہو۔

مجتہدین کے بھی درجات ہیں۔ جو عالم فقہ کے سارے ابواب میں اجتہاد کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اس کو مجتہد مستقل یا مجتہد مطلق کہتے ہیں۔ انگریزی میں مجتہد مستقل کی تعریف یوں بنتی ہے:

"An Absolute Legist formulating independent decisions in legal or theological matters,based on the interpretation and application of the whole usul (i.e)Qran,Sunnah,Ijm'a and Qiyas"

اسی طرح مجتہد مطلق کے بعد مجتہد غیر مطلق یا غیر مستقل کا درجہ آتا ہے۔ اس درجہ پر فائز مجتہد اصول اجتہاد میں کسی مجتہد مطلق کا مقلد ہوتا ہے لیکن مسائل کے استخراج اور استنباط میں اسکی پیروی کے بجائے اپنے اجتہاد پر عمل کرتا ہے۔ مجتہد مطلق غیر مستقل کے بعد ''مجتہد مقید یا تخریج'' کا درجہ آتا ہے۔ اس درجہ پر فائز مجتہد کسی امام مجتہد (مجتہد مطلق) کے مسلک کے اندر رہ کر اس کے بیان کردہ اصولوں کے مطابق ہی نئے مسائل کا استنباط واستخراج کرتا ہے۔ مجتہد مقید کے بعد مجتہد ترجیح کا درجہ آتا ہے۔ اس قسم کا مجتہد اپنے مسلک کے مختلف مسائل میں دلیل کے ذریعہ باہم ایک دوسرے پر ترجیح دے کر ترجیح کی علت بیان بیان کرنے پر قادر ہوتا ہے۔ اس کے بعد مجتہد فتویٰ کا درجہ آتا ہے۔ مجتہد فتویٰ وہ مجتہد کہلاتا ہے جو چار مشہور ومعروف مسلکوں میں سے ایک مسلک میں مقلد ہوتا ہے اور فتویٰ دیتے وقت زمان ومکان کے مطابق، تغیریات ومطالبات کو سامنے رکھ کر نہایت ہی بصیرت کے ساتھ فتویٰ دینے پر قادر ہو۔

اس تمام تر تفصیل کا احاطہ کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اقبالؒ نے اپنے عصر میں جن اصحاب کو کار اجتہاد کے لئے اہل قرار دیا تھا کیا واقعی ان میں مذکوہ بالا صلاحیتیں تھیں، ساتھ ہی ساتھ یہ بھی یہ دکھاتا

ہے کہ اقبالؒ نے کس قسم کے اجتہاد کے لئے ان کو چنا تھا۔

جیسا کہ ہم نے اس مقالے کی ابتداء ہی میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے حوالے سے لکھا تھا کہ ڈاکٹر صاھب نے فقہ کی جدید تدوین کے لئے حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ کو اپنی بصیرت سے چنا تھا ۔ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر جو قومی اور بین اقوامی سیاسی ،معاشی اور سماجی احوال سے تعلق رکھنے والے مسائل تھے۔جن کا حل ڈھونڈنا ابھی علماء اسلام کے ذمہ باقی تھا۔ان کا صحیح حل بتانے کی صلاحیت اسی مرد عظیم میں تھی۔ڈاکٹر صاحب نے پوری وضاحت اور صراحت سے یہ بات سعید صاحب کو گوش گزار کی تھی کہ میری حیثیت صرف ایک مستفتی کی ہوگی اور حضرت مولانا انور شاہ صاحب کی حیثیت (فقہی اصطلاح میں اگر ہم کہیں تو) ایک مجتہد فتویٰ کی ہوگی۔مجتہد فتویٰ زمان ومکان کے تغیرات ومطالبات کو سامنے رکھ کر فتویٰ سازی کا کام کرتا ہے۔زمانے کے تغیرات ومطالبات اور مسائل کا علم ڈاکٹر صاحب کو کتب بینی اور جہان بینی سے خوب ہوا تھا۔ڈاکٹر صاحب اپنی اس آگہی کی بنیاد پر استفتیٰ تیار کرتے اور پھر اس استفتیٰ کو مجتہد فتویٰ یعنی مولانا انور شاہ صاحب کے سامنے پیش کرتے وہ قرآن وحدیث اور فقہ مدونہ پر غور وفکر کر کے پیش کئے گئے مسائل کا جواب دے دیتے۔کیونکہ شاہ صاحب جامع المعقول و منقول شخصیت تھی۔ہر علم وفن کی امہات کتب کا مطالعہ فرما کر ان کی مشکلات فقہ کا حل فرما چکے تھے۔ہر علم میں اپنی رائے رکھتے تھے۔دینی علوم متداولہ کے علاوہ فن طب ،جفر،رمل اور نجوم کے ماہر تھے۔اس کے علاوہ مصر سے چھپی ہوئی اس زمانے کی جدید سائنسی کتب کا گہرائی سے مطالعہ کرتے تھے۔

شاہ صاحبؒ کے علاوہ جس شخص پر اقبالؒ کو نظر تھی۔وہ کوہستانی عالم حضرت مولانا سید جمال الدین افغانیؒ تھے۔جن کی مدح میں اقبالؒ کا یہ شعر ایک سند سے کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا ہے ؎

سید السادات مولانا جمال ☆ زدہ از گفتار او سنگ وسفال

اقبال نامہ حصہ دو مصفحہ نمبر ۲۳۱ تا ۲۳۲ بنام چوہدری محمد احسن صاحب میں اقبالؒ اس طرح رقمطراز ہیں:

''زمانہ حال میں اگر کوئی شخص میرے نزدیک مجدد کہلانے کا مستحق ہے تو وہ صرف جمال الدین افغانی ہے۔مصر وایران ،ترکی ،ہند کے مسلمانوں کی تاریخ جب کوئی لکھے گا تو اسے سب سے پہلے عبدالوہاب نجدی اور بعد میں جمال الدین افغانیؒ کا ذکر کرنا ہوگا۔موخر الذکر اصل میں

موسس ہے زمانۂ حال کے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا''۔

اسی طرح سید جمال الدین افغانی کی شخصیت کچھ اور ہی تھی۔قدرت کے طریقے عجیب وغریب ہوتے ہیں۔مذہبی فکر وعمل کے لحاظ سے ہمارے زمانے کا سب سے ترقی یافتہ مسلمان افغانستان میں پیدا ہوتا ہے۔جمال الدین افغانی دنیائے اسلام کی تمام زبانوں سے واقف تھے۔ان کی فصاحت وبلاغت میں سحر آفرینی ودیعت تھی۔ان کی بے چین روح ایک ایک اسلامی ملک کا سفر کرتی رہی اور اس نے ایران ،مصر اور ترکی کے ممتاز ترین افراد کو متاثر کیا ہمارے زمانے کے بعض جلیل القدر علماء جیسے مفتی محمد عبدہٗ اور نئی پود کے بعض افراد جو آگے چل کر سیاسی قائد بن گئے جیسے مصر کے زاغلول پاشا وغیرہ انہیں کے شاگردوں میں سے تھے۔انہوں نے لکھا کم اور کہا بہت اور اس طریقے سے ان تمام لوگوں کو جنہیں ان کا قرب حاصل ہوا چھوٹے چھوٹے جمال الدین بنا دیا۔انہوں نے کبھی مجدد یا نبی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔پھر بھی ہمارے زمانے کے کسی شخص نے روح اسلام میں اس قدر تڑپ پیدا نہیں کی جس قدر کہ انہوں نے کی تھی۔ان کی روح اب بھی دنیائے اسلام میں سرگرم عمل ہے اور کوئی نہیں جانتا اس کی انتہا کہاں ہوگی''۔

تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے صفحہ نمبر ۱۵۲ پر ان کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

''ہمارا فرض ہے کہ ماضی سے اپنا رشتہ توڑے بغیر اسلام پر بحیثیت ایک نظام فکر کے دوبارہ غور کریں۔بظاہر شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے سب سے پہلے بیداری روح کا احساس دلایا۔مگر اس کام کی اہمیت کا اندازہ سید جمال الدین افغانیؒ کو تھا جو اسلام کی ملی حیات اور ذہنی تاریخ پر عمیق نظر رکھنے کے علاوہ انسانی عادات وخصائل کا بے نظیر تجربہ رکھتے تھے ان کی نظر میں بڑی وسعت تھی''۔

علامہ کی ان اقتباسات سے معلوم ہوا کہ علامہ کے نزدیک جمال الدین افغانیؒ میں جہاں گوناگوں صلاحیتیں تھیں وہیں درج ذیل صلاحیتیں نمایاں تھیں:

۱: وہ دنیائے اسلام کی تمام زبانوں سے واقف تھے۔

۲: وہ نہایت فصیح وبلیغ تھے یعنی فصاحت وبلاغت پر ان کو عبور تھا۔

۳: ملی حیات اور ذہنی تاریخ پر عمیق نظر رکھتے تھے۔

۴: وہ انسانی خصائل وعادات کا بے نظیر تجربہ رکھتے تھے۔

چونکہ کار تجدید کے لئے مندرجہ صدر صلاحیتیں مقدمہ کی حیثیت رکھتیں ہیں اور یہ صلاحیتیں افغانیؒ میں تھیں لہٰذا علامہؒ نے ان کو کار تجدید کے لئے اہل قرار دیا۔ خیر کار اجتہاد ہو یا تجدید کے لئے غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل ہونا ضروری ہے یہ ایک ایسا ہتھیار ہے جو کسی ماہر کو ہی دیا جا سکتا ہے ۔جس طرح ایٹمی ہتھیار **(Nuclear Weapon)** اعلیٰ تربیت یافتہ اذہان رکھنے والے آدمی کے سپرد کئے جاتے ہیں اور کسی عام فوجی کے ہاتھ میں ان ہتھیاروں کو تھما دینا انسانیت کے ساتھ نا انصافی اور ظلم ہوگا۔ اسی طرح کار اجتہاد و تجدید کے لئے اسلامی علوم سے لیس اور عصری مطالبات اور مسائل پر گہری نظر رکھنے والے جید علماء و فقہاء درکار ہیں۔ عام دانشور امت کو اسلامیت کے روپ میں گمراہ بھی کر سکتے ہیں۔ علامہؒ کو اس حقیقت کا بخوبی علم تھا۔

جو علامہؒ کی نظروں میں کار اجتہاد و تجدید کی صلاحیت رکھتے تھے وہ خود اپنی نظروں میں

علامہؒ نے جن دو نابغۂ روزگار شخصیتوں کو کار اجتہاد کے لئے چنا تھا کیا وہ خود کو اس منصب کے اہل سمجھتے تھے؟ یہ ایک سوال ہے جسکا جواب شاید ان حضرات کے حق میں مفید ثابت ہوسکتا ہے جو اجتہاد اور تجدید کا بارے میں افراط و تفریط کے شکار ہیں۔ اگر چہ یہ حضرات علوم اجتہاد سے مالال تھے لیکن اس منصب کی حساسیت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ حضرات اس ذمہ داری کو سر لینے سے بہت چُوکتے تھے۔ جس طرح ایک حدیث کی شرح کرنے کے بعد علامہؒ نے حضرت انور شاہ صاحبؒ کو دنیائے اسلام کا جید ترین محدث وقت کہہ کر اس بات کا اعتراف کیا کہ انور صاحب علوم حدیث میں کمال درجہ رکھتے ہیں اسی طرح جب حضرت علامہ علی مصریؒ جو صحیحین کے تقریباً حافظ تھے مصر سے سورت اور راندیر آئے، وہاں حضرت مولانا مفتی سید محمد مہدی صاحب مفتی گجرات سے ملاقات ہوئی اور آپ نے علامہ مصری کو دیوبند جانے کا مشورہ دیا تو وہ دہلی سے ہوکر دیوبند بھی پہنچے۔

زمانہ قیام دارالعلوم میں استاتذہ کے درس میں بیٹھے اور خصوصیت سے حضرت شاہ صاحبؒ کے یہاں درس بخاری شریف سنا۔ حضرت شاہ صاحب نے درسی تقریر بھی ان کی رعایت سے عربی میں کی ۔علامہؒ نے سوالات کئے حضرت شاہ صاحبؒ جواب دیتے رہے درس کے بعد فرمانے لگے:

''میں نے عرب ممالک کا سفر کیا اور علمائے زمانہ سے ملا.....خود مصر میں کئی سال حدیث شریف کا درس دیا ہے۔ میں نے شام سے لے کر ہند تک اس شان کا کوئی محدث و عالم دین نہ دیکھا ۔میں نے ان کو ہر طرح بند کرنے کی سعی کی لیکن ان کے استحضار علوم و تیقظ، حفظان و ایقان اور ذکاوت و وسعت نظر سے حیران رہ گیا''۔

علامہؒ نے دارالعلوم میں تین ہفتے قیام کیا اور حضرتؒ سے برابر استفادہ کرتے رہے اور ایک دفعہ جوش میں آکر کہا کہ ''**لو حلفت انہٗ اعلم من ابی حنیفہ لما حنثت**'' جب حضرت شاہ صاحبؒ کو یہ جملہ پہنچا تو سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا اور ارشاد فرمایا ''ہمیں امام کے مدارج اجتہاد تک قطعاً رسائی نہیں ہے''

شاہ صاحب کے اس مختصر سے جملے سے ثابت ہوا کہ حضرت علامہ انور شاہؒ کشمیری باوجود اس جلالت علمی کے جس کا اعتراف اس دور کے کبار معاصر علماء نے کیا خود کو ائمہ اجتہاد کے مقابلہ میں پیش نہیں کرتے تھے اور اعتراف کرتے ہیں کہ امام اعظمؒ جیسا مجتہد مطلق جن اجتہادی مدارج کا حامل تھا ان تک انہیں رسائی نہیں ہے۔

اسی طرح علامہؒ کی یہ تحقیق کہ '' **حضرت مولانا جمال الدین افغانیؒ نے کبھی مجدد ہونے کا دعویٰ نہیں کیا**'' سے یہ بات ظاہر ہورہی ہے کہ کار تجدید کا کام کرنے کے باوجود بھی افغانیؒ جیسا مصلح دعویٰ کرنے سے کتراتا ہے خدا ہمیں اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں حضور ﷺ کے اس دعا کی دلی کیفیت عطا فرمائے

☆**اللھم اجعلنی فی عینی صغیراً وجعلنی فی اعین الناس کبیرا**☆

تقلید واجتہاد

ماسٹر غلام نبی وانی فتح گڈھی ایم۔اے فارسی، عربی (بی۔ایڈ) کشمیر یونیورسٹی

تمام مسلمان اس بات کو مانتے ہیں کہ اسلام کی تعلیم کا بنیادی مآخذ قرآن وحدیث ہے۔اور قرآن و حدیث میں اس قدر ہدایت کا سامان موجود ہے کہ قیامت تک مسلمانوں کو دائیں بائیں دیکھنے کی ضرورت نہیں۔صحابہ کرامؓ براہِ راست قرآن وحدیث سے استفادہ کرتے تھے۔ان کی زبان عربی تھی اور قرآن و حدیث کا پورا ذخیرہ عربی میں ہی تھا۔اس زبان کو سمجھنا اور اس کے مطابق عمل کرنا اُن کے لئے مشکل نہ تھا۔اس سے بڑھ کر یہ بات بھی اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ کوئی مشکل پیش آنے کی صورت میں وہ معاملہ فوراً حضورﷺ کی خدمت اقدس میں پیش کرتے تھے اور حضورﷺ اللہ کے منشا اور اپنی نبوت کی نورانی فراست سے وہ معاملہ حل فرمادیتے تھے یہاں تک کہ حضورﷺ ۱۱ ہجری میں اعلان نبوت کے بعد ۲۳ برس تک صحابہ کرام کو دین سے روشناس کرتے رہے اور دین کو مکمل شکل میں صحابہ کرامؓ تک پہنچا دیا۔لیکن حضورﷺ اپنے نور نبوت سے پہلے جان ہی چکے تھے کہ انسانی زندگی متحرک **(movable)** ہے اور متحرک زندگی میں نئے نئے مسائل سے دوچار ہونا ایک قدرتی بات ہے اور ہر مسئلے کا حل تلاش کرنا ایک انسانی ضرورت ہے۔اسی ضرورت کے احساس کے پیش نظر ایک دفعہ جب حضورﷺ نے معاذ بن جبل کو یمن کی طرف (قاضی بنا کر) بھیجا تو پوچھا کہ تم وہاں جا کر فیصلہ کس طرح کروگے۔انہوں نے عرض کیا کہ جو کچھ اللہ کی کتاب میں ہے اس کے مطابق فیصلہ کروں گا۔آپﷺ نے فرمایا اگر وہ اللہ کی کتاب میں نہ ہو تو (یعنی تم جس بات کا فیصلہ کرنا چاہو وہ بات قرآن شریف میں نہ پاؤ تو پھر کیا کروگے) انہوں نے عرض کیا تو پھر اللہ کے رسولﷺ کی سنت سے (فیصلہ کروں گا) آپﷺ نے فرمایا اگر سنت میں نہ پاؤ تو (پھر کیا کروگے) انہوں نے کہا کہ اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔حضور نبی کریمﷺ نے فرمایا اللہ کی حمد جس نے رسولﷺ کے قاصد کو (صحیح طریقِ عمل کی توفیق دی۔(حوالہ (۱) ترمزی شریف (۲) ابوداؤد شریف۔

اب جو شخص قرآن وحدیث میں کسی مسئلہ کا جواب نہ پا کر اجتہاد کرے گا اس کو شریعت کی روشنی میں مجتہد کہتے ہیں۔

اجتہاد کی تعریف

قرآن وحدیث پر قیاس کر کے شرعی مسائل کے متعلق نئی بات دریافت کرنا۔

مجتہد کی تعریف

ایسی صلاحیت کا مالک جو قرآن وحدیث پر قیاس کر کے شرعی مسائل کے متعلق کوئی نئی بات دریافت کرے۔صحابہ کرامؓ سے ایسی مثالیں بکثرت ملتی ہیں کہ انہوں نے ضرورت کے وقت اپنی قوت اجتہاد سے قرآن وحدیث کی روشنی میں نئے پیش آنے والے واقعات ومعاملات میں قیاس سے کام لے کر مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی جس کی حضورﷺ نے پہلے ہی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔

کیا ہر شخص اجتہاد کرسکتا ہے؟

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہر شخص حضرت معاذ بن جبلؓ کی طرح اجتہاد کرسکتا ہے اس کا آسان سا جواب یہ ہے کہ حضرات علماء کرام نے اس کے لئے چند شرائط رکھی ہیں جو عام طور پر ہر شخص میں نہیں پائی جاتی ہیں لہٰذا نہ جاننے والے کو یا کم جاننے والے کو اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ اہل علم حضرات کی طرف رجوع کرے جن کو اس درجہ کا علم ہو اور جن کے اجتہاد پر اعتماد کیا جائے۔مثلاً احادیث میں بھی بعض جگہ تناقض (ایک دوسرے کی ضد) نظر آتا ہے۔ان احادیث کی جانچ پڑتال کرنا اور قرآن وحدیث کے رموز کو سمجھنا ہر آدمی کے بس کا کام نہیں۔پھر بات یہاں تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ یہ بھی دیکھنا ہے کہ اگر حضورﷺ کے بعد کئی صحابہؓ نے کسی معاملہ میں اجتہاد کیا ہوگا اور اپنی اپنی سوچ کے مطابق ان کے درمیان کوئی اختلاف واقع ہوا ہوگا تو عام لوگ کس پر عمل کریں۔اس کے لئے شریعت نے کون سا اصول وضع کیا ہے اور اس وقت مسئلے کا حل کیسے سامنے آئے گا۔

اختلافی صورت میں کیا کریں؟

اُوپر جو اجتہاد کی تعریف بیان ہوئی اب اس میں توسیع ہو جائے گی اب اجتہاد کی تعریف یوں بنے گی۔''قرآن وحدیث اور اجماع پر قیاس کر کے شرعی مسائل کے متعلق نئی بات دریافت کرنا''۔

اجماع کی تعریف

ان علماء کا کسی ایک رائے پر متفق ہونا جن کی صلاحیت اور دیانت شکوک وشبہات سے بالاتر ہو اور مسئلہ بھی وہ ہو جس کے متعلق قرآن وحدیث میں کوئی واضح اشارہ موجود نہ ہو اور پھر وہ اس مسئلہ کے متعلق کوئی قانونی اصول وضع کریں جو قرآن وحدیث کے مزاج سے متصادم نہ ہو:

(The consensus of religious scholars whose competence and piety are beyond qustion to provide legal opinion on a subject not directly ruled up on Quran.

کیا اجتہاد اور اجماع کی مذکورہ تعریف کو کسی نے تسلیم کیا ہے؟

مذکورہ تعریف کے ساتھ پورے عالم کے حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی حضرات اتفاق کرتے ہیں اور اپنی اپنی فقہ ترتیب دینے میں اسی اصول کو اپنایا ہے۔ اگر چہ ان چار مذاہب کے علاوہ اس دور میں کچھ اور مذاہب بھی تھے لیکن یہ ایک تکوینی بات (یعنی ایسی بات جس میں بندوں کے ارادے خدا کے حکم کے سامنے بے بس ہوں) بنی کہ ان ہی چار مذاہب کا سلسلہ آگے چلا اور امت کی اکثریت نے اس ضابطے کے ساتھ اتفاق کیا۔ اور اس وقت بھی اسی ضابطے کے تحت پورے عالم میں ان مذاہب کا سلسلہ چل رہا ہے۔ اور کوئی ایک دوسرے پر اعتراض نہیں کر رہا ہے۔

کیا اس اصول کے ساتھ کوئی اختلاف کرتا ہے؟

جی ہاں! ایک طبقہ ہے جن کا موجودہ نام اہل حدیث ہے یا سلفی۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ کسی امام کی تقلید ضروری نہیں ہے بلکہ ہر شخص قرآن وحدیث سے براہِ راست استفادہ کر سکتا ہے بیچ میں کسی واسطے یا امام وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

کیا ہر آدمی قرآن وحدیث سے مسائل دریافت کر سکتا ہے؟

اس کا بہترین جواب مودودی صاحب نے رسائل ومسائل میں دیا ہے چنانچہ وہ ''مذہب حنفی اور حدیث'' کے عنوان کے تحت ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں کہ:

''لیکن یہ عام اہل حدیث جو ان مسائل پر بحث کرتے پھرتے ہیں ان کا حال عام حنفیوں سے کچھ زیادہ بہتر نہیں ہے۔ ان کا علم بھی ویسا ہی تقلیدی ہے جیسا حنفیوں کا علم ہے۔ یہ اپنے ائمہ وعلماء پر اعتماد کرتے ہیں اور حنفی اپنے ائمہ وعلماء پر۔ ان میں خود اجتہادی قابلیت نہیں۔ نہ یہ احادیث کا اتنا علم اور اصول میں اتنی بصیرت رکھتے ہیں کہ احکام کی تحقیق کر سکیں۔ ان کا یہ کہنا کہ فاتح خلف امام یا رفع یدین یا آمین بالجہر حدیث سے ثابت ہے اور اس کا خلاف ثابت نہیں، دراصل تقلید کی بنیاد پر ہے نہ کہ اجتہاد کی بنیاد پر۔ لہٰذا ان کے جواب میں خاموشی بہتر ہے۔ البتہ جو علم رکھتے ہیں وہ ان مسائل پر بول سکتے ہیں''۔

کیا صالحین اور اہل علم کی پیروی جائز ہے؟

یہ سوال کہ کس کی پیروی اور اتباع جائز ہے اور کس کی نہیں اس کے لئے قرآن نے ایک اصول بتایا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ'' لَاتُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ ''(احزاب) (ترجمہ) کافروں اور منافقوں کی پیروی نہ کرو۔'' وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَ كَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا'' (الکہف) اور پیروی مت کرو ایسے شخص کی جس کے قلب کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے اور وہ اپنی نفسانی خواہش پر چلتا ہے اور اس کا یہ حال حد سے گذر چکا ہے۔'' فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ''(القلم) حق کو جھٹلانے والوں کی پیروی نہ کرو۔ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا 0 (الدھر۲) اور گنہگاروں اور ناشکری کرنے والوں کی پیروی مت کرو۔

اس کے برعکس پورے قرآن میں یہ کہیں نہیں کہا گیا ہے کہ صالحین اور اہل علم کی پیروی نہ کرو بلکہ قرآن کہتا ہے **فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لاتعلمون** (النحل۶) اگر تم نہیں جانتے تو جاننے والوں سے پوچھو۔ **اولٰئک الذین هدیٰ الله فبهداهم اقتده** (انعام) (ترجمہ) اور جن کو اللہ نے ہدایت دی ہے ان کے راستے کی پیروی کرو۔ ان آیات کی روشنی میں ثابت ہو کہ صالحین اور اہل علم کی پیروی نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے۔

پھر اہل حدیث اور مقلدین میں کیا فرق ہے؟

جب ثابت ہوا کہ اہل حدیث حضرات بھی اپنے ائمہ اور علماء پر اعتماد کرتے ہیں اور چار مذہبوں پر چلنے والے مسلمان بھی اپنے ائمہ اور علماء پر اعتماد کرتے ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ فرق ہی کیا رہا؟ اس کا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ اصولی طور پر کچھ فرق نہیں ہے البتہ کچھ لوگوں کو لفظی نزاع (**Verbal or literal dispute**) جاری رکھنے میں مزا آتا ہے اور لوگوں کو فضول بحثوں میں مشغول رکھنا بے کار

بیٹھے رہنے سے اچھا لگتا ہے۔خدا ہم پر رحم کرے۔(آمین)

حرف آخر

Last Word

تمام تر بحث کو سمیٹتے ہوئے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نہ ہی عام مقلد حضرات ائمہ سے بے نیاز ہو کر براہِ راست قرآن وحدیث سے مسائل کا جواب اپنی نارسا سمجھ کے مطابق اخذ کر سکتے ہیں اور نہ ہی اہل حدیث حضرات اپنے علماء سے بے نیاز ہو کر شریعت کے ساتھ انصاف کر سکتے ہیں۔اسی طرح قیامت تک جو نت نئے مسائل پیش آنے والے ہیں ان کی تحقیق وتفتیش کے متعلق نہ ہی چار مذاہب کے اماموں نے کوئی سخت قدغن لگائی اور نہ ہی اہل حدیث لگا سکتے ہیں البتہ تحقیق اور تفتیش کے متعلق جو شرائط امت کے بڑے بڑے حضرات علماء نے لگائی ہیں ان کو ہمیشہ محل نظر رکھنا ہر انصاف پسند آدمی کا کام ہے۔اس تناظر میں اگر انصاف سے کام لیا جائے تو چار مذاہب میں سے کسی کو اپنا مسلک تبدیل کرنے کی کوئی عقلی ونقلی وجہ نہیں ہے اور جہاں کوئی شخص چار مذاہب میں کسی ایک مذہب پر صدیوں سے قائم شدہ ماحول میں جی رہا ہے وہاں اس کو اسی مذہب کو تھامے رہنا چاہئے اور تبدیل مذہب کی لاحاصل کوشش یا تحصیل حاصل کوشش میں اپنا وقت صرف کرنے کے بجائے دین اسلام کی خدمت پر اپنا فکری اور عملی سرمایہ خرچ کرنا چاہئے۔اسی طرح اہل حدیث کے نام سے کوئی پانچواں مذہب جاری کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ احادیث کا جتنا ذخیرہ محدثین کے ذریعے امت تک پہنچا ہے مجموعی طور پر چاروں مذاہب میں تمام احادیث پر عمل ہو رہا ہے۔ہاں امت کے ایک حصہ میں اگر حضور ﷺ کی ایک محبوب سنت پر عمل ہو رہا ہے تو دوسرے حصہ میں دوسری سنت پر عمل ہوتا ہے۔اور چاروں مذاہب کے اندر ایک منظّم اور مدلل طریقہ ترتیب دیا جا چکا ہے جس کو روز بدلنا بجز انتشار کے کوئی ٹھوس فائدہ نہیں پہنچا سکتا ہے۔اور لوگوں کو یہ منظّم طریقے اختیار کرنے کے بغیر کوئی چارہ کار بھی نہیں ہے جن کو ترتیب دینے میں اُمت کے کبار علماء نے اپنی زندگیاں نچھاور کر دی ہیں۔خدا ان کی قبروں کو نور سے بھر دے۔اسی طرح لفظ اہل حدیث بھی کوئی بُرا لفظ نہیں ہے۔البتہ بنیادی شُد بُد سے محروم آدمی کو بھی اہل حدیث کہنا ایسا ہی ہے جیسا کسی آٹھویں جماعت کے طالب علم کو بیرسٹر کہنا نامناسب ہے۔ہاں اگر واقعی کوئی صاحب علم ایسا ہوگا جس کا علمی مرتبہ درجہ اجتہاد تک پہنچ چکا ہو جس کی تعریف پہلے گذر چکی ہے تو ایسے آدمی کو اہل حدیث کہنے میں کچھ حرج نہیں۔لفظ اہل حدیث کے ساتھ کسی کو نفرت کیسے ہو سکتی ہے مگر عربی زبان سے نابلد اور قرآن وحدیث سے ناآشنا آدمی کا اپنے کو اہل حدیث کہنا یا کہلوانا بھاری معلوم ہوتا ہے۔

☆☆☆

پیر رومیؒ کے تین کشمیری مرید

علمدار کشمیرؒ، اقبالؒ اور مرغوب بانہالی مدظلہ عالی

(نوٹ) یہ مقالہ پروفیسر مرغوبؔ بانہالی کی کشمیری کتاب ''قدیم کاشُر'' میں ''حضرت شیخ العالمؒ اکھ خاص قران شناس شاعر قبیلک فرد'' عنوان کے تحت شائع ہوا ہے۔ادارہ راہِ نجات نے پیر رومیؒ اور مرید ہندیؒ کے تحت مارچ اور اپریل کے دو شمارے شائع کئے مرید ہندی سے مراد علامہ اقبال ہے جنہوں نے خود بھی اپنے آپ کو مرید ہندیؒ کا خطاب بخشا ہے۔چونکہ وہ اصلاً کشمیری تھے اور ان سے پہلے شیخ العالمؒ نے بھی رومی ہی کی طرح قرآن پاک کی بہترین انداز سے ترجمانی کی ہے لہٰذا وہ بھی پیر رومی کے ایک معنوی مرید ہیں۔ان کی طرف یہ مصرعہ بھی منسوب کیا جاتا ہے کہ ''ملہٕ دپزِ تہٕ مولوی رومس'' یعنی ملا (جو ایک بہت بڑا لقب ہے) کہلانے کا اگر کوئی مستحق ہے تو وہ مولوی رومیؒ ہی ہے۔عصرِ حاضر کے کشمیری ادیبوں میں مرغوب صاحب نے بھی مولانا اشرف علی تھانویؒ کی طرح اپنی تصانیف میں رومیؒ کے اشعار کا جا بجا حوالہ دیا ہے۔میرے خیال میں اگر مرغوب صاحب کو بھی رومیؒ کے کشمیری مریدوں میں شمار کیا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔لہٰذا ان کے مقالے کا عنوان بدل کر احقرؔ نے اس مقالے کا نام ''پیر رومی کے تین کشمیری مرید رکھا ہے'' تاکہ کشمیر کے عارفوں اور دانشوروں کا رومی کے ساتھ جو عقیدت کا معاملہ ہے وہ نوجوان نسل کے لئے چشم کشا بن جائے۔چنانچہ مرغوبؔ صاحب اپنے مقالے میں اس طرح رقم طراز ہے۔

☆☆☆

مقالے کا ترجمہ معہ عنوانِ جدید مترجم وانی عاصیؔ

اپنی تخلیقات میں سینکڑوں تجربات کی رنگینی اور آفاقی پہچان کی شرینی کے ساتھ قرآنی ارشادات کی روشنی میں سنوار کر جن عجمی شاعروں کو تلامذالرحمٰن یا خدائی شاگرد بننے کی سعادت حاصل ہوئی ہے ان میں مولانا رومیؒ کو ایک خاص مقام حاصل ہوا ہے۔مولانا کی عرفانی شاعری قرآن پاک کی بہترین ترجمانی سمجھی جاتی ہے۔اسی لئے کہا گیا ہے کہ ؎

مثنوی معنوی مولوی ☆ ہست قرآن درزبان پہلوی

مولانا رومی کی مثنوی معنوی پہلوی (فارسی) زبان میں قرآن ہے۔مگر مولانا رومی بذات خود اس قرآن شناس قبیلے کے عجمی شاعروں کی آنکھوں کا تارا اور سربراہ حکیم سنائی غزنوی ہی کو سمجھتا ہے ساتھ ہی وہ اس قبیلے کا روح شیخ فریدالدین عطار کو قرار دیتا ہے۔چنانچہ وہ فرماتے ہیں ؎

عطار روح بود وثنائی دو چشم او ☆ ما از پئے ثنائی وعطار آمدیم

(ترجمہ) عطار مانند روح تھا اور ثنائی اس کی دو آنکھیں۔ہم ان دو حضرات یعنی ثنائی اور عطار کے بعد ان کی راہ پر چلنے والے ہیں۔حکیم ثنائی اسی طرح شیخ عطار کا جو (حدیقۃ الحقیقت جیسا کیمیائی نسخہ لکھنے والا) پختہ کار پیشرو گذرا ہے جس طرح منطق الطیر جیسی تمثیلی شاہکار کو وجود میں لانے والا شیخ عطار مولانا رومی کا پختہ کار پیشرو گذرا ہے۔گویا ان سے پہلے وفات یافتہ مجذوب اور مست پیشرو بابا طاہر عریان کو ایک طرف چھوڑ کر حکیم ثنائی سرزمینِ عجم کا وہ پہلا شاعر ہے جو قرآن پاک کو بہترین اور مکمل ترین سرچشمہ سمجھتا ہے۔جو فن شاعری کے جمالیاتی ذمہ داری کے بوجھ کو اٹھانے کے وقت محسن اعظم کا امتی ہونے کی معاشرتی ذمہ داری کو نبھاتا ہے۔جو غفلت میں پڑے ہوئے مسلمانوں کو جنہوں نے حضور

ﷺ کے اسوہ حسنہ کو فراموش کیا ہے اور جو جگہ جگہ غیر اقوام کی پاوں کے نیچے دبنے والے غافل مسلمانوں کو ان کی کوتاہیوں کیطرف متوجہ کر کے اور ان لوگوں کو متوجہ کر کے جنہوں نے مسلمانوں کو مسلکی فتنوں میں مبتلا کر کے مسلمانوں کے دین دشمن عالموں کا کچا چھٹا بیان کر کے ان کی خوب خبر لیتا ہے۔ثنائی ایک ایسا شاعر ہے جو قومی غیرت اور ملی عصمت کو نیلام کرنے والوں کی نشان دہی کرتا ہے۔جو قلمی جہاد کی فرضیت کو پہچان کلمة الحق عند السلطان جائر (کی روشنی میں) وقتی اقتدار کے چیلے چانٹے بننے والے بے غیرت دانشوروں کے ساتھ باضابطہ رودررو ٹکر لے لیتا ہے۔جو ایسے مجاہدانہ اقدام کے جوابی حملوں اور سزا کو برداشت کر کے ملت کی نئی نسل کو بذریعہ شاعری خون کے آنسوں بہاتے بہاتے اپنی قوم کی عظمت رفتہ یاد دلاتا ہے۔جو کلمہ توحید پڑھ کر شہادت گاہِ الفت میں قدم رکھنے والے ہر فرد کو باایمان رہنے کا ثبوت دینے کے لئے اجتماعی اصلاح اور فلاح ڈھونڈنے کے کارِ خیر میں شریک ہونے کی ترغیب دیتا ہے جو مجموعی طور پر اغیار پرست مسلمان بستیوں میں حقیقی اسلامی معاشرت کو وجود میں لانے کے لئے انقلاب پروری، دانشوری محنت پسندی اور یک جہتی پیدا کرنے کا خواہاں ہیں۔

حکیم ثنائی کے بعد شیخ عطار بھی اسی راہ پر گامزن ہو کر شہید ہو جاتا ہے اس لحاظ سے حقیقی اسلام دوستی کے درد و سوز پر مبنی خاص فارسی قصیدے، غزل اور رباعی تخلیق کرنے والا حکیم ثنائی بھی مولانا رومی کا ایسا ہی معنوی مرشد اور رہبر گذرا ہے، بہر حال میں یہاں تبرکاً حکیم ثنائی کی ایک غزل نما نظم کے صرف تین اشعار پیش کروں گا جن میں حکیم ثنائی نے حضرت ابوذر غفاریؓ اور حضرت سلمانِ فارسیؓ جیسے سادگی پسند عظیم المرتبت اصحاب رسول ﷺ اور جان نثارانِ اسلام کی دینداری کا آفتاب، شکم پرست عالموں، ریاکار زاہدوں کے ذریعے اقتدار پسندی کے کالے بادلوں کے نیچے دب جانے کا ماتم کیا ہے اور ان اشعار میں ساتھ ہی اغیار پرست مسلمان دانشوروں اور آوارہ ذہن فلسفیوں کی قرآنی عرفان کو چھوڑ کر یونانی حکمت کا طواف کرنے والوں کی اغیار پسندی کی نہج کا طنز اس طرح کیا ہے ؎

فروشد آفتاب دین، برآمد روز بے دینا ☆ کجا شد درد بوذر روا، وآں اسلام سلمانی
شراب حکمت شرعی خورید اندر حریم دین ☆ کہ محروم اند ازیں عشرت حوس گویانِ یونانی
بروں کن تو کہ عقلانی بسوئے ذوقِ ایمان شو ☆ چہ باشد حکمت یونان بہ پیش ذوق ایمانی

(ترجمہ) دین کا سورج دب گیا اور بے ایمان لوگوں کا دن روشن ہو گیا۔ہائے افسوس وہ ابوذر غفاریؓ کا درد و سوز کہاں گیا اور وہ سلمان فارسی کا اسلام کہاں گیا۔اے میرے دینی بھائیو دین کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے شریعت کی حکمت کے جام نوش فرمالو کیونکہ اس لذت سے یونانی فلسفہ کے جنونی بے ہودہ باتیں بکنے والے محروم ہیں۔تو عقل کا پٹہ اپنی گردن سے باہر پھینک اور ذوق ایمان کی طرف گامزن ہو جا کیونکہ ذوق ایمان کے سامنے حکمت یونان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

جاری

(گذشتہ سے پیوستہ)

ماسٹر غلام نبی وانی فتح گڈھی

شرعی اور فقہی اصطلاحات کی وضاحت سوال وجواب کی روشنی میں

سوال نمبر:۔اب جو نیا فلسفہ وجود میں آیا ہے اس کے سبب کون سا فرقہ وجود میں آیا؟

جواب: اس نئے فلسفے سے فرقہ نیچر یہ وجود میں آیا۔

سوال:۔فرقہ نیچر یہ کس خیال کے لوگ ہیں؟

جواب:۔ یہ لوگ قرآن اور حدیث سے ثابت مسائل کی فلسفہ فرنگ کے مطابق تاویل کرتے ہیں۔

سوال:۔فلسفہ فرنگ کا کیا مطلب ہے؟

جواب:۔فرنگ مغربی ممالک کو کہتے ہیں جہاں زیادہ تر انگریز لوگ رہتے ہیں۔مثلاً برطانیہ، فرانس، جرمنی وغیرہ۔ان ممالک میں پچھلی چند صدیوں میں زبردست مادی ترقی (**Meterial Progress**) ہوئی اور مادہ ان کے ذہن پر اس قدر سوار ہوا کہ وہ ہر چیز کی مادی تعبیر یا مادی تفسیر کرنے لگے کیونکہ اُن کو مادے کے بغیر کچھ سوجھتا ہی نہیں ہے۔

سوال:۔اہل اسلام کا اس بارے میں کیا عقیدہ ہے؟

جواب:۔ دنیا میں جتنی چیزیں ہیں ان کو عربی اور فارسی میں اسباب کہتے ہیں اور مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ تمام چیزیں خود بہ خود پیدا نہیں ہوئی ہیں بلکہ ان کا کوئی پیدا کرنے والا ہے اور اس کو وہ مسبب الاسباب (**Causeofcauses**) کہتے ہیں اور اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ ہی ان چیزوں کو بنانے والا وجود بخشنے والا ہے اور وجود بخشنے کے بعد وہ ان سے لاتعلق نہیں ہوا بلکہ اس کا ان چیزوں پر پورا پورا کنٹرول ہے۔

سوال:۔ان چیزوں پر کنٹرول ہونے کا کیا مطلب ہے؟

جواب:۔ پورا پورا کنٹرول ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ چاہے گا ان چیزوں سے عام طور پر وہی کچھ ہوگا جس کے لئے یہ چیزیں بنائی گئی ہیں آگ سے گرمی ظاہر ہو جائے گی۔برف سے ٹھنڈک محسوس گی لیکن وہ ایسا بااختیار مالک ہے کہ کبھی کبھی اس عام روش سے ہٹ کر وہ ان ہی چیزوں سے اس کے برعکس نتائج مرتب کر کے دکھا دیتا ہے۔

سوال:۔ کیا اس قسم کی کوئی مثال قرآن کریم میں موجود ہے؟

جواب:۔جی ہاں! بہت ساری مثالیں موجود ہیں مثلاً اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کے لئے آگ کو گلزار بنا دیا ۔فرعون کو پانی میں جلا دیا۔لوہے کو حضرت داؤد کے ہاتھ میں موم بنا دیا، کتنی مثالیں دی جائیں۔ قرآن مجید میں اس قسم کی مثالیں موجود ہیں۔

سوال:۔ایسا کیوں ہوتا ہے۔یہ بات عقل کس طرح تسلیم کرسکتی ہے؟

جواب:۔یہ ایک صاف اور سیدھی سی بات ہے اور ایک آسان مثال سے سمجھ میں آسکتی ہے۔مثلاً کسی شخص کے پاس ایک کروڑ روپے کی کرنسی موجود ہے اور ظاہر ہے کہ وہ اس رقم سے ایک مکان بھی بنا سکتا ہے۔ایک دکان بھی خرید سکتا ہے ایک موٹر کار بھی خرید سکتا ہے اور اس نے ان سب باتوں کا رادہ بھی کیا اور کل جب وہ بازار یا کہیں اور یہ چیزیں خریدنے کے لئے جاتا ہے تو صرف ایک گھنٹہ پہلے بادشاہ کی طرف سے اعلان ہوتا ہے کہ اس نمبر کے نوٹ منسوخ کئے جاتے ہیں جس میں یہ سب نوٹ بھی آتے ہیں تو ساری کرنسی اپنے پاس موجود ہونے کے باوجود ان تمام چیزوں میں سے کچھ بھی خرید نہیں سکتا ہے۔

سوال:۔یونانی فلسفہ کے سبب کون سا فرقہ وجود میں آ گیا؟

جواب:۔یونانی فلسفہ کے سبب فرقہ معتزلہ وجود میں آ گیا۔

سوال:۔جدید فلسفہ کے سبب کون سا فرقہ وجود میں آ گیا۔

جواب:۔جدید فلسفہ کے سبب فرقہ نیچریہ پیدا ہو گیا۔یہ لفظ دراصل انگریزی زبان کے لفظ (**Nature**) سے لیا گیا ہے اس کا لفظی معنی فطرت یا پیدائش ہے۔اسی لفظ کو بنیاد بنا کر خدا بیزار اور مادہ پرست لوگوں نے ایک فلسفہ ترتیب دیا اور اس کا نام (**Naturalism**) رکھا یعنی فطرت پرستی اور حقیقت پسندی اور اس فلسفے کے ماننے والے کو (**Naturist**) یعنی فطرت پسند یا فطری حالت میں زندگی گذانے والا کہتے ہیں بلکہ ڈکشنری میں اس کا ایک معنی یہ بھی لکھا ہے کہ جو شخص لباس سے بے نیاز ہو۔

سوال:۔کیا نیچری قسم کے لوگوں کا اور بھی کوئی نام ہے؟

جواب:۔جی ہاں انگریزی زبان میں اس قسم کا سوچ رکھنے والوں کو مادہ پرست، **Materialist** یا دہریہ ،منکر خدا (**Atheist**) بھی کہتے ہیں۔جدید تہذیب کی بنیاد اسی نظریہ دہریت پر ہے۔اس کا سیدھا سادہ مطلب خدا کے وجود کا انکار یا دوسرے الفاظ میں بے یقینی ہے۔دہری لوگوں کا عقیدہ ہے کہ یہ کائنات خود بہ خود وجود میں آئی ہے۔یہ سارا نظام خود بہ خود چلتا ہے اور یہ خود بہ خود چلتا رہے گا۔تمام کائنات اس کے تمام

تر حیران کن مظاہروں کے ساتھ ایک ناگہانی دھماکے کا نتیجہ ہے۔اور اس کے پیچھے کسی کاریگر کی منصوبہ بندی، ہاتھ اور مقصد نہیں ہے۔کائنات بے سوچے سمجھے وجود میں آئی ہے اور بلکل اچانک طریقے سے اس کا خاتمہ ہوگا۔

جاری

گذشتہ سے پیوستہ

ماسٹر غلام نبی وانی فتح گڈھی

(درس مثنوی)

(گذشتہ قصے یعنی "بادشاہ کا لونڈی پر عاشق ہونا" کا خلاصہ)

خلاصہ اس قصہ کا یہ ہے کہ انسان عشق مجازی سے نکل کر عشق حقیقی کی طرف کوچ کرے۔ عشق مجازی اور عشق حقیقی کی فرق مولانا اس شعر میں بیان فرماتے ہیں ؎

عشقہا ئے کز پئے رنگے بود ☆ عشق بنود و عاقبت ننگے بود

(ترجمہ) وہ عشق جو رنگ کی خاطر ہوتا ہے۔ عشق نہیں ہوتا، انجام کار ذلت اور رسوائی ہوتا ہے۔

جس طرح لونڈی سنار کے ظاہری حسن پر فریفتہ تھی اور اس کا حسن ختم ہوتے ہی اس کو اسکے ساتھ نفرت پیدا ہوئی اسی طرح دنیا کی زیب وزینت تھوڑی دیر کے لئے آدمی کی آنکھوں کو چکا چوند کرتی ہے لیکن حقیقت کھلنے پر بدنما معلوم ہوتی ہے لہٰذا عاشقان صادق پہلے ہی سے اس کے ساتھ دل نہیں لگاتے ہیں ؎

زانکہ عشق مردگاں پایندہ نیست ☆ چونکہ مردہ سوئے ما آیندہ نیست

عشق آں زندہ گزین کُو باقی است ☆ وز شراب جانفزایت ساقی است

عشق آں بگزیں کہ جملہ انبیا ☆ یافتند از عشق اُو کار و کیا

(ترجمہ)

۱: اس لئے کہ مردوں سے عشق پائیدار نہیں ہے اس لئے کہ مردہ ہمارے طرف آنے والا نہیں ہے۔

۲: اُس زندہ کا عشق اختیار کر جو سدا رہنے والا ہے اور جانفزا شراب سے تجھے سیراب کرنے والا ہے۔

۳: اس کا عشق اختیار کر کہ جس کے عشق سے تمام نبیوں نے عزت وشرف پایا۔

"**دوسرا سبق**" جو مولانا اس حکایت کے ذریعے ہمیں دینا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ آدمی کو گریہ وزاری سے کام لے کر اپنے مسائل اللہ سے حل کروانے چاہیں اور ناامید ہو کر یہ نہ کہنا چاہئے کہ مجھے اس رب کریم کی بارگاہ تک رسائی نہیں ہوسکتی ہے فرماتے ہیں کہ ؎

تو مگو ما را بداں شہ بار نیست ☆ بر کریماں کار ہا دشوار نیست

(ترجمہ) تو یہ نہ کہہ کہ ہماری رسائی اس بادشاہ تک نہیں ہے۔ کریموں پر بڑے کام دشوار نہیں ہوتے۔

جس طرح بادشاہ طبیبوں سے ناامید ہوا اور پھر اللہ کی بارگاہ میں ہاتھ پھیلا کر اللہ سے مانگا تو اللہ نے غیب سے اس کے لئے راستہ کھولا اور ایک خدائی طبیب کی نشاندہی خواب میں کی۔ صبح وہ سب کچھ ہوا جو بادشاہ نے خواب میں دیکھا تھا۔

"**تیسرا سبق**" جو مولانا اس حکایت کے ذریعے ہمیں دینا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ خدائی طبیب جب آپ کو اپنی تربیت میں لینے کے لئے قبول فرمائیں گے تو ہر بات پر ان سے سوال وجواب کا دروازہ کھولنے کا طریقہ اختیار مت کرو یہاں تک کہ وہ خود ہی تمہیں ہر بات کی علت سے آگاہ کریں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

آں پسر را کش خضرؑ ببرید حلق ☆ سر آں را در نیابد عام خلق

(ترجمہ) وہ لڑکا خضرؑ نے جس کا گلا کاٹا تھا اس کا بھید عام مخلوق نہیں سمجھ سکتی۔

گر خضرؑ در بحر کشتی را شکست ☆ صد درستی در شکست خضر ہست

(ترجمہ) اگر چہ خضرؑ نے سمندر میں کشتی توڑ دی۔ لیکن خضرؑ کے توڑنے میں سو درستیاں تھیں۔

سورہ کہف میں قصہ تفصیل سے آیا ہے۔ بظاہر خواجہ خضرؑ نے چند کام عقل کے خلاف کر لئے اور موسیٰؑ نے ہر بار خضرؑ سے پوچھا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا اور بار بار نہ پوچھنے کے متعلق جو عہد و پیمان خضرؑ اور موسیٰؑ کے درمیان ہوا تھا ان کو بھلا کر موسیٰؑ یہ واقعات دیکھ کر صبر نہ کر سکے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خضرؑ نے ان کاموں کی حقیقت حضرت موسیٰؑ سے بیان فرما کر جدائی اختیار کی۔ مولانا نصیحت فرماتے ہیں اسی طرح ہر بات پر اپنے مرشد سے پوچھ گچھ نہ کرنی چاہئے یہاں تک کہ وہ خود ہی سب امور کی حقیقت سالک کے سامنے بیان کرے یا صبر کرنے کے بعد حقیقت خود بہ خود سالک پر کھل جائے۔ اس قصہ میں ایک واقعہ بلکل ہی خلاف عقل نظر آتا ہے اور وہ یہ کہ طبیب نے سنار کو کیوں شربت دے کر قتل کیا۔ اسی تناظر میں مولانا نے اگر چہ اوپر کے اشعار فرمائے ہیں لیکن پھر دوبارہ ایک صاحب ارشاد بزرگ کی طرح نصیحت فرماتے ہیں ؎

قہر خاصے از برائے لطف عام ☆ شرع می دارد روا بگذار گام

(ترجمہ) عام مہربانی کیلئے کسی خاص پر قہر شریعت جائز رکھتی ہے۔ قدم آگے بڑھا۔

مطلب یہ کہ زرگر کے قتل میں اگر بظاہر یک گونہ ظلم نظر آتا ہے لیکن بادشاہ چونکہ عادل تھا اور اس سے لوگوں کو فائدہ پہنچنے کی قوی امید تھی لہٰذا عام مفاد اور مصلحت کے پیش نظر کسی ایک پر ظلم جائز ہے۔ جیسا کہ

قصہ خضرؑ و موسیٰؑ میں واضح ہے کہ نوعمر کو قتل کرنے میں مصلحت یہ تھی کہ وہ والدین کے لئے دردسر بنتا اور لڑکے کا فائدہ بھی اس کے قتل میں ہی تھا کیونکہ والدین کا نافرمان بن کر وہ خدا کے عذاب کا مستحق بن جاتا۔ اللہ نے پہلے ہی اس کو قتل کروا کر دونوں کو آنے والی تکالیف سے راحت دلوائی۔ آخر پر مولانا ایک اور قیمتی نصیحت فرماتے ہیں

؎

طفل می لرزد زنیش احتجام ☆ مادر مشفق دراں غم شادکام

(ترجمہ) پچنے لگانے کی تکلیف سے بچہ لرزتا ہے لیکن اس کی مہربان ماں اس تکلیف سے خوش ہوتی ہے۔ گندے خون کو جسم سے نکالنے کے لئے زخم دینے کو ''پچنے لگوانا'' کہتے ہیں یہ ایک قسم کی ڈاکٹری چیر پھاڑ ہوتی ہے جسے انگریزی میں (Surgery) کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ بچہ اس عمل سے ڈرتا ہے اور ماں باپ خوش ہوتے ہیں کہ گندہ خون خارج ہو جائے گا اور بچہ صحت یاب ہو جائے گا۔ اسی طرح مرشد کامل کبھی کسی کو مشقت میں ڈالتا ہے اور اسے مجاھدے کراتا ہے لیکن نادان لوگ بزرگوں کی بات سمجھنے سے قاصر ہو کر اُن پر الٹا اعتراض کرتے ہیں۔

جاری

آپ کے مکتوبات بنام راہِ نجات

مدیر محترم:

اسلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہٗ

مزاج گرامی!

رسالہ 'راہ نجات' کے آج تک کے سارے شمارے نظر سے گذرے۔ مزاج و منہج کو نظر میں رکھ کر محتاط انداز میں کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل انشاء اللہ خوب تر و روشن ہوگا۔ اولین شمارے میں عالم اسلام کی عظیم ترین دینی تحریک جسے عوام کی زبان میں تبلیغی جماعت کہا جاتا ہے کا کشمیر میں تاریخی پس منظر پیش کر کے آپ نے واقعی با برکت شروعات کی۔ پھر پیر رومی، مرید ہندی، علامہ اقبال نمبر شائع کر کے آپ نے رسالے کو وادی کے طول و عرض سے شائع ہونے والے دیگر رسائل میں ایک انفرادی شان کا رسالہ ثابت کر دیا۔

احقر کی چند گذارشات نظر التفات چاہتی ہیں

یہ دور علمی تحقیق و عقلی جستجو کا دور ہے۔ اب بات کو دلائل و براہین سے ثابت کرنے کی زیادہ ضرورت ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مغربی طرز تعلیم نے حقائق کے ثبوت کے لئے صرف عقل و حواس کو ہی حتمی کسوٹی کے طور پر قبول کیا ہے۔ ہمارا جدید تعلیم یافتہ طبقہ اسی تناظر میں پروان چڑھا ہے۔ بات یہاں تک پہنچتی ہے کہ قرآن و سنت کے غیر متبدل اور ابدی اصول و احکام بھی اگر سمجھ میں نہ آسکیں تو اقرار مشکل اور انکار آسان ہو جاتا ہے۔ ستم ظریفی یہ کہ غیبیات کے ثبوت کے لئے بھی محسوسات کے ثبوت کے لوازم کو ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے بہت سے بظاہر دین دار افراد و طبقہ ہائے فکر بھی اسی افسوسناک روش پر گامزن ہیں۔

اس تناظر میں آپ کے رسالے سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں کہ آیندہ دانش جدید کی اس کجروی سے بھی تعارض کیا جائے گا۔

تعصب و تحزّب کو کبھی نہ پسند کیا گیا اور نہ ہی اس سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ ہی نکل سکتا ہے سوائے کینہ پروری کے، حق کو نظر انداز کر کے۔ آپ سے انشاء اللہ صرف حق کی ترجمانی ہو نہ کہ انسانی ذہن کی خود ساختہ

نظریات کی۔

آپ کا سوال و جواب والا کالم قابل ستائش ہے۔جن حضرات کو کتاب وقلم سے مس ہوگا وہ خوب جانتے ہونگے کہ محنت شاقہ درکار ہوتی ہے ایسے کالموں کیلئے اللہ ہمت عطا کرے اور دقت نظر بھی۔

آئے دن بازار میں دینیات سے متعلق بے شمار کتابیں چھپ کر آتی ہیں۔کتابیات کے عنوان سے مختلف کتابوں پر تبصرے **(Book review)** کا کالم شامل کرلیا جائے تو سونے پہ سہاگا ثابت ہوگا۔

امید ہے کہ آگے رسالے کا معیار بلند تر ہوگا جس کے لئے زیادہ سے زیادہ اہل علم کی کاوشات کو جگہ دی جائے گی۔رسالہ کا اعلیٰ تحقیقی وعلمی سطح کا ثابت ہونے کے لئے ضروری ہے کہ جو مقالات ومضامین اصول تحقیق کو نظر میں رکھ کر لکھے گئے ہوں انہی کو شائع کیا جائے۔

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

احقر العباد

(ڈاکٹر)نزیر احمد(زرگر صاحب)(ایم۔اے ایم فل۔پی ایچ۔ڈی اسلامیات کشمیر یونیورسٹی)

بسم اللّٰہ الرحمن الرّحیم

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

مکتوب بنام جناب مدیر صاحب وسرپرست اعلیٰ صاحب ماہنامہ راہ نجات بارہ مولہ

اسلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہٗ

خیریت طرفین مطلوب ،توفیق سداد مسئول،حسن خاتمہ مامول اور مغفرت باری مرجو

آپ کی جانب سے ’راہِ نجات‘ کے چند شمارے موصول ہوئے ،اگرچہ اپنی روایتی غفلت اور معمول کی از حد مشغولیت کی بنا پر تمام شماروں کا بالاستیعاب مطالعہ نہ کر پایا تاہم اکثر مضامین وعناوین نظر سے گذرے۔بس پڑھ کر یہی دعا نکلی:

خدا کرے زور قلم اور زیادہ

مضامین علمی واستدلالی اور سائنٹیفک ہیں اگر چہ سرپرست اعلیٰ ہی کے مضامین ہوتے ہیں بمصداق ع

بقامت کہتر وبقیمت بہتر

البتہ مضامین میں تنوع ضروری ہے اہل علم کے لئے دینی طلبہ کیلئے بالخصوص رسالہ از حد مفید ہے۔ہمارے حضرت الاستاذ حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالنپوری مدظلہ(شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند) نے ایک مرتبہ ۱۹۸۵ء میں ترمذی شریف ج ا کے درس میں فرمایا:

”۔۔۔سنو! دینی جریدہ اور رسالے کا نکالنا آسان ہوتا ہے مگر اس کو جاری اور برقرار رکھنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے“۔۔۔یہ حقیقت پر مبنی بات ہے اب تک کتنے رسالے نکلے مگر ایک دو شماروں کے بعد وہ غائب ہو گئے۔

رسالہ اپنے ظاہری ومعنوی حسن و جمال میں ۔الحمدللہ۔معیاری ہے۔حضرت حق جلالہٗ اخلاص اور استقامت علی الحق نصیب کرے آمین۔

(مفتی)محمد اسحٰق نازکی(زید مجدھم)بانڈی پورہ

(نوٹ)مولانا موصوف دارالعلوم رحیمیہ بانڈی پورہ میں بحثیت استاد اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔اس کے علاوہ کئی تحقیقی مقالات وتصنیفات کے مصنف بھی ہیں۔نیز مولانا کا شمار وادی کے مشہور علماء میں ہوتا ہے۔خدا ان کی علمی خدمات کا نفع پوری امت مسلمہ کو پہنچائے اور ان کا سایہ ہمارے سروں پر تادیر رہے۔آمین